بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ | ۲۵ر جون ۲۰۲۶ء مطابق ۹ر محرم الحرام ۱۴۴۸ھ | شمارہ نمبر ۱۶

اس شمارے میں

ذکر یارانِ نبیؐ	مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی	۴
نیا سال اور ہجرت و فتح کی یادِ لازوال	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۵
انفاق فی سبیل اللہ	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
صحابہ کرامؓ کا مقام و مرتبہ	مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی	۹
سوال و جواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۱۰
مولانا حاجی سید معین الدین ندویؒ	مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی	۱۱
ہجرتِ نبویؐ کا آفاقی و ابدی پیغام	حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۳
زندگیاں صحابہ کرامؓ کی...	مولانا محمد جعفر مسعود حسنی ندویؒ	۱۵
مولانا ڈاکٹر محمد شعیب نگرامی ندویؒ	مولانا محمد فیضان نگرامی ندوی	۱۷
محرم الحرام- حقائق اور خرافات	مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی	۱۸
انسانی اور اخلاقی اقدار کا بحران	مولانا محمد وثیق ندوی	۲۰
علمِ نافع کا قرآنی تصور	مولانا محمد نصر اللہ ندوی	۲۳
طلاق کا اختیار مرد کو کیوں؟	مولانا منور سلطان ندوی	۲۵
علامہ اقبالؒ اور ان کے تعلیمی نظریات	ڈاکٹر محمد عارف جنید ندوی	۲۷
حیاتِ فانی اور حیاتِ جاودانی	محمد جاوید اختر ندوی	۲۹
تعارف و تبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۳۱
محرم الحرام: فکر و احتساب کا مہینہ	محمد نفیس خان ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی

نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT

Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی و امریکی ممالک کے لئے $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30 چوجوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہو چکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت و نشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر و ادب

ذکرِ یارانِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

جاں نثاروں میں جو سب سے اوّل ہوا
شانِ صدّیقیت میں مکمل ہوا
سالکِ راہِ حق کی وہ مَشعل ہوا
بعد از انبیا وہ جو افضل ہوا
ہاں وہی نائب خاتم المرسلین
یعنی شیدائے پیغمبر عالمیں

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

وہ عمر جن سے ڈرتا تھا شیطان بھی
جن کی تائید کرتا تھا قرآن بھی
جن کی ٹھوکر میں کسریٰ و خاقان بھی
جن سے الفت ہے تکمیلِ ایمان بھی
ہاں وہ فاروقِ اعظم ہیں سلطانِ دیں
یعنی شیدائے پیغمبرِ عالمیں

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ

تیسرے یار عثماں مجسم حیا
وہ کہ دو نور جن کو ہوئے تھے عطا
پیکرِ حِلم و الطاف و جود و سخا
رشکِ روحُ الامیں جن کی نوری قبا
ہاں وہی پاکیِ ذہن و دل کے امیں
یعنی شیدائے پیغمبرِ عالمیں

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

جس کے پیکر میں بے تاب تھیں بجلیاں
جس نے پھونکا تھا حق کے لیے آشیاں
دشمنوں کے مقابل وہ تیغ و سناں
جس سے پُر نور تھا معرفت کا جہاں
ہاں علی گنجِ حکمت کا دُرِّ ثمیں
یعنی شیدائے پیغمبرِ عالمیں

جاں نثارِ نبی

لب پہ جاری ہوا ذکرِ یارِ نبی
غم گُسارِ نبی، یارِ غارِ نبی
چار یارِ نبی، جاں نثارِ نبی
حق کے میدان میں راہوارِ نبی
ہو تری جان سمعانؔ قربانِ دیں
یعنی شیدائے پیغمبرِ عالمیں

ادار یہ

نیا سال اور ہجرت و فتح کی یادِ لازوال

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

اسلامی تعلیمات وروایات کے مطابق سال کے بارہ مہینوں میں چار مہینے ایسے ہیں جو خاص پس منظر کی وجہ سے حرمت والے مہینوں کی امتیازی پہچان لیے ہوئے ہیں۔ ان چار مہینوں کا حُرمت اور احترام کی صفات کے ساتھ تعین کیوں ہوا؟ اس کا ایک جواب قرآن مجید کے حرف حرف پر غور کرنے والوں کے نزدیک یہ ہے کہ عربوں کی عادت تھی کہ وقتی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر جس مہینے کو چاہتے ادب واحترام والا قرار دیتے اور سال کے مہینے بھی بڑھا دیتے۔ قرآن مجید نے چار مہینوں کی تعیین کر کے اس قسم کے وقتی فیصلوں کو نامنظور کر دیا۔ حرمت والے مہینے بظاہر قتال کی ممانعت کا اعلان تھے لیکن اہل نظر نے یہ راز بھی پالیا کہ حرمت والے مہینوں میں گناہ اور معصیت دوسرے دنوں سے زیادہ سزا اور عذاب کی مستحق بناتی ہے اور دوسری جانب اطاعت اور احکام کی بجا آوری، ثواب میں زیادتی کا سبب بھی بن جاتی ہے۔

محرم الحرام کی اہمیت کے لیے یہی کافی تھا لیکن اس مہینے سے نئے سال کے آغاز نے اس کو دوسرے مہینوں سے فائق تر پہچان دے دی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اس کی اہمیت، ہجرت کے عظیم واقعہ سے نسبت کی وجہ سے ملی۔ اسلامی سال کی ابتدا محرم کے مہینے سے ہونے اور پھر اس نئے سال کو ہجرت کی نسبت اور شناخت حاصل ہونے کی حکمتیں مسلسل بیان ہوتی رہتی ہیں۔ جاننے والوں کی زبان پر خدا جانے کتنی حقیقتیں اور کتنی باریکیاں آتی رہتی ہیں۔ سوالات ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ اسلامی تقویم یا جنتری یا کیلنڈر کو ظہور قدسی یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے منسوب کیا جا سکتا تھا یا نزول قرآن اور منصب نبوت سپرد کیے جانے کے واقعہ سے یا تاریخ انسانی کے سب سے دوررس معرکہ حق وباطل میں بدر کے میدان میں حق کی فتح کی یاد سے بھی نئے سال کی نسبت کی جا سکتی تھی یا اس سے بھی زیادہ وہ مکہ مکرمہ کی تاریخ ساز فتح، وقت کی نئی پیمائشوں کے لیے مناسب ترین یادگار بن سکتی تھی۔ یہ انتخاب بھی بہتر ہی کہا جاتا۔ حجۃ الوداع اور اس کے لافانی خطبے کی یادوں سے نئے اسلامی سال کی تعیین بھی مناسب ہی ہوتی یا سب سے بڑھ کر وہ ناقابل فراموش حقیقت ہوتی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے شدید ترین لمحات کو قیامت تک کے لیے اثر انگیز بنا دیتی۔ ان تمام ممکنات کے ہوتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی حیات طیبہ کے ایک ایک پل کو دل میں بسا لینے والوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے کامل اداشناسوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے مدینہ کی ہجرت کو اسلامی تقویم کا سرعنوان قرار دیا تو یہ امت اسلامیہ ہی نہیں، پیغمبروں کے بعد تاریخ انسانی کے منتخب ترین ذہنوں کی بے مثال نظر کے اعتراف اور شہادت کا ثبوت بن گئی۔

ہجرت کا لفظ اپنے ظاہری معنی واحوال سے اس کیفیت کے اظہار کا نام ہے جو کمزوری، بے بسی، بے کسی، لاچاری دربدری اور حال و مستقبل کی ہر تمنا اور ہر فکر سے محرومی اور خود اپنی زندگی اور اپنے وجود کے غیر یقینی ہونے کا مفہوم رکھتی ہے۔ جہاں انسان کی اپنی فطری اور طبعی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہجرت میں آزادی رائے اور آزادی فکر سے بھی دستبرداری ہے۔ قرآن مجید میں ہجرت والوں کے لیے **الذین أخرجوا من دیارھم بغیر حق** کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اپنے وطن اور اپنے دیار سے ظالموں کے ذریعے نکالے جانے کا عمل ہی ہجرت کی پہلی پہچان ہے۔ یہ ظلم کی ایک تصویر ہے، دوسری تصویر اس سے بھی دردناک ہے جب کسی علاقہ کے رہنے والے ظلم سہتے سہتے یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ **ربنا أخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم أھلھا** کہ اے رب ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، ہجرت کی بے بسی اور ہجرت کرنے والوں کی بے بضاعتی اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ ان کی زبانوں پر کسی دوست اور کسی مددگار حمایتی ملنے کی تمنا فریاد بن کر رہ جاتی ہے۔ **واجعل لنا من لدنک ولیاً واجعل لنا من لدنک نصیراً**۔

ہجرت انسانوں پر انسانوں بلکہ انسان نما شیطانوں کا سب سے زیادہ ظالمانہ اور قابل نفرت عمل ہے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے بندوں کو، اللہ کے نام لینے کی پاداش میں گھر سے بے گھر کر دینا' صرف شیطان کو اپنا سرخیل ماننے والوں ہی کا کام ہوسکتا ہے؛ لیکن ایسا کرنے والے یہ نہیں دیکھ پاتے کہ بظاہر زمین، گھر بار، خاندان اور احباب سے جدا کر دینے میں اور اس سے پیدا ہونے والی بے بسی میں مقابلہ کرنے اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی نمناک آنکھوں سے اپنے محبوب وطن کو دیکھ رہے تھے اور لرزتے لبوں سے خطاب کر رہے تھے کہ اے مکہ تو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے لیکن تیرے رہنے والے مجھے تیری آغوش میں رہنے نہیں دیتے۔ اس وقت یہ الفاظ بظاہر اپنی بیچارگی کا احساس دلا رہے تھے؛ لیکن ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ احساسات بھی اپنی موجودگی کا اعلان کر رہے تھے کہ ان دیکھے تائیدی لشکروں کی تائید اور اللہ کی بات کی سربلندی کا اعلان بھی ان الفاظ کے ساتھ ساتھ ہے اور یہ اس لیے کہ **لا تحزن إن اللہ معنا** کا یقین انتہائی بے بسی میں بھی عروج اور کامرانی کا نغمہ چھیڑ کر دل و دماغ کو سکون بخشتا ہے۔ شکست سے فتح، بے یقینی سے یقین اور محکومی سے حاکمیت کی ہر حقیقت کا اظہار ہجرت کے معانی میں شامل ہے۔ یقین کرنے والوں نے یقین کو حقیقت میں بدلتے دیکھا تھا اور یہ نکتہ ان پر عیاں ہو گیا تھا کہ فتح مکہ کے لیے ہجرت ناگزیر تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ دو انسانوں کی ہجرت نہ ہوتی تو دس ہزار انسانوں کا فاتح لشکر بھی نہ ہوتا۔

اسلام سے پہلے دنیا کی ہجرتوں کا سلسلہ گو اب نہیں ہے لیکن حق کو دبانے اور بے دخل کر دینے والی شیطانی طاقتوں کا شیرازہ منتشر ہونے کے باوجود موجود ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھنے کے لیے اسلامی سال کی ہجری نسبت کی اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے۔

☆☆☆

تعلیم القرآن

انفاق فی سبیل اللہ

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

{وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ} (البقرۃ: ۳)
(اور ہم نے ان کو جو کچھ رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔)

اس آیت میں ایک تصور دیا گیا کہ اگر تم مال خرچ کررہے ہو تو وہ مال تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ وہ مال تمہیں اللہ ہی نے دیا ہے، گویا کسی کا مستعار مال ہے، کسی نے تمہارے پاس رکھوایا ہے تو اس کے بعد تمہارے اندر یہ خیال پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ تمہارا مال ہے، وہ مال تمہارا نہیں بلکہ اللہ کا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ}
(النور: ۳۳)
(اور (اے ایمان والو!) اللہ نے تمہیں جو مال دیا ہے اس میں سے ان کو دے دو۔)

انفاق فی سبیل اللہ کی اصطلاح میں توسع ہے، اس میں زکوٰۃ بھی شامل ہے اور صدقات واجبہ بھی، صدقات نافلہ بھی شامل ہیں اور راہِ خدا میں خرچ کیا جانے والا ایک ایک حبہ بھی، یہاں تک کہ عارفین کہتے ہیں کہ رزق کا لفظ بہت عام ہے، اس میں صرف مال ہی نہیں آتا بلکہ اگر کسی کے پاس علم ہے یا صفات حسنہ ہیں اور وہ ان کو لوگوں میں تقسیم کررہا ہے تو یہ بھی اللہ کا کرم ہے اور ایسے شخص کے متعلق اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ جس طرح راہِ خدا میں خرچ کرنے سے مال میں برکت ہوتی ہے، اسی طرح علم کی تقسیم سے علم میں برکت ہوتی ہے اور تقویٰ کی تقسیم سے تقویٰ میں برکت ہوتی ہے۔

روایت میں آتا ہے کہ ہر روز دو فرشتے نازل ہوتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ:

”اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقاً خَلَفاً، اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكاً تَلَفاً“ (صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فی المنفق والممسک: ۲۳۸۳) (اے اللہ! جو خرچ کرنے والا ہے اس کو بدل دے دے اور جو روکنے والا ہے اس کا مال تلف کرلے۔)

اس دعا میں ساری چیزیں آجاتی ہیں یعنی اگر کوئی علم کا صحیح استعمال نہیں کرتا تو اس کا علم منجمد ہوجاتا ہے اور آہستہ آہستہ اٹھ جاتا ہے، اگر دیکھا جائے تو انفاق میں یہ ساری حقیقتیں موجود ہیں، تاہم خاص طور سے اللہ کے راستہ میں مال کو خرچ کرنا' اللہ کی بڑی نعمتوں اور عبادتوں میں سے ہے۔

اللہ کے جن خاص بندوں کا انتخاب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے ان کی یہ صفت ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں خوب خرچ کرتے ہیں، حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سخاوت کا حال یہ تھا' لگتا تھا کہ ایک دریا ہے، انھوں نے اپنے آخری وقت میں خود ہمیں بلا کر فرمایا کہ اتنے پیسے رکھے ہوئے ہیں، ان کو تقسیم کردو، یہاں تک کہ اپنی وفات سے پہلے انھوں نے سب صاف کردیا، انتقال سے چند منٹ قبل اس گنہگار سے فرمایا کہ اس میں سے اتنا فلاں کو اور اتنا فلاں کو دے دینا، حقیقت میں انفاق کا یہ ذوق آدمی کے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا کردیتا ہے اور دل کھل جاتا ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کی مثال حدیث میں زرہ سے دی گئی ہے کہ:

”مثل المنفق والمتصدق كمثل رجل عليه جبتان أو جنتان من لدن ثديهما إلى تراقيهما فإذا أراد المنفق أن يتصدق سبغت عليه أو مرت وإذا أراد البخيل أن ينفق قلصت عليه وأخذت كل حلقة موضعها حتى تجن بنانه وتعفو أثره۔“
(صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب مثل المنفق والبخیل: ۲۴۰۶)
(اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور صدقہ دینے والے کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے دو زرہیں پہن رکھی ہوں، جو اس کے سینے سے لے کر گلے تک ہوں۔ جب سخی آدمی صدقہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ زرہ پھیل جاتی ہے اور اسے ڈھانپ لیتی ہے، لیکن جب بخیل آدمی خرچ کرنا چاہتا ہے تو وہ زرہ اس پر تنگ ہوجاتی ہے اور ہر کڑی اپنی جگہ چمٹ جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کی انگلیاں بھی چھپ جاتی ہیں اور اس کے قدموں کے نشانات تک مٹ جاتے ہیں۔)

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جیسے لوہے کے لباس میں کڑیاں ہوتی ہیں، اب اگر آدمی اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو وہ کڑیاں کھلتی ہیں اور اگر نہیں دیتا تو جکڑتا چلا جاتا ہے پھر وہ دینا

چاہتا بھی ہے تو اس کے پاس سے کچھ نہیں نکلتا، مثل مشہور ہے ''چمڑی جائے دمڑی نہ جائے'' یعنی مطلب یہ ہے کہ کچھ بھی ہو جائے مگر پیسہ نہیں نکلے گا، بعض لوگوں کا ایسا مزاج ہوتا ہے، لیکن دینے والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہو وہ اللہ کے راستے میں دے دیتے ہیں، ان کو آگے کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، حضرت رابعہ بصریہ کا واقعہ مشہور ہے، ان کے یہاں افطار کے لیے کچھ نہیں تھا، افطار سے تھوڑی دیر پہلے کسی نے دس انڈے بھیجے تو انھوں نے اپنی خادمہ سے کہا کہ ابھی افطار میں وقت ہے، ان کو اللہ کے راستے میں خرچ کر دو، اللہ کچھ اور انتظام کرے گا، خادمہ نے ضرورت سمجھ کر ایک انڈا روک لیا اور نو انڈے صدقہ کر دیئے، پھر افطار سے پہلے کہیں سے ۹۰/ انڈے آ گئے، تو حضرت رابعہ بصریہ نے اپنی خادمہ سے کہا: لگتا ہے تم نے کچھ کمی بیشی سے کام لیا تھا، اس لیے کہ اللہ کے راستے میں ایک خرچ کرنے پر دس ملنے کا وعدہ ہے، اگر تم نے دس انڈے دیئے ہوتے تو ۱۰۰/ انڈے آتے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ واقعہ سچا ہو، حقیقت بھی یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ اس طرح کی چیزیں پیش آتی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر آدمی دیتا ہے تو اللہ کی طرف سے برکت ہوتی ہے اور اگر بخل سے کام لیتا ہے تو وہ اپنے مال سے خود فائدہ نہیں اٹھا پاتا بلکہ اکثر وہ مال ضائع ہوتے دیکھا گیا ہے۔ حاصل یہ کہ انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ ان ایمان والوں کی ایک بنیادی صفت ہے جن کے اندر تقویٰ ہے۔

☆☆☆

شائقین کتب کے لیے خوش خبری

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی علیہ الرحمہ پر دو نئی کتابیں منظر عام پر

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے ڈھائی سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، دنیا میں ان کی عظیم خدمات کا شایانِ شان بدلہ عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

راقم الحروف نے حضرت کی وفات کے بعد تین کاموں کا عزم کیا تھا:

(۱) حضرت کی سوانح پر مشتمل کتاب کی اشاعت۔ (۲) حضرت کے خطوط کو جمع کرنا۔ (۳) حضرت کے وہ مقدمے، تقریظیں اور پیش لفظ جو مختلف کتابوں کے لیے تحریر فرمائے گئے، ان کو یکجا کر کے شائع کرنا۔

الحمد للہ! اول الذکر دو کام تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ حضرت کے خطوط ''مکتوبات مرشدِ امت'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں تقریباً چار سو خطوط شامل ہیں، جو حضرت نے اکابرِ امت اور اپنے شاگردوں کو تحریر فرمائے۔ یہ کتاب 432 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے دوسرے حصے کی تیاری بھی جاری ہے۔ جن حضرات کے پاس حضرت کے مزید خطوط ہوں، وہ براہِ کرم کمپوز کر کے ذیل کے نمبر پر ارسال فرمائیں۔

اسی طرح دوسری کتاب ''خانوادۂ حسنی کے روشن چراغ'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے، جس میں خانوادۂ حسنی (علم اللّٰہی) کے چھ افراد کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب 832 صفحات پر مشتمل ہے اور بہترین طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آ چکی ہے۔

اب تیسرا اہم کام باقی ہے، یعنی حضرت کے وہ مقدمے، تقریظیں اور پیش لفظ جو مختلف کتابوں کے لیے تحریر فرمائے گئے ہیں، انہیں جمع کر کے شائع کرنا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ **وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔**

اس سلسلے میں تمام متعلقین و احباب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر آپ کے پاس کوئی ایسی کتاب موجود ہو جس پر حضرت نے (اردو یا عربی میں) مقدمہ، تقریظ یا پیش لفظ تحریر فرمایا ہو تو براہِ کرم درج ذیل پتے پر ارسال فرما کر تعاون فرمائیں۔ ارسال کرتے وقت درج ذیل امور کا خیال رکھیں:

(۱) کتاب کا فوٹو۔ (۲) مصنف کا مختصر (دو تا تین سطور میں) تعارف۔ (۳) اگر کتاب بآسانی دستیاب ہو تو اس کا ایک نسخہ بھی ارسال فرمائیں (یہ معہد کے کتب خانے جمع ہوگی)۔ (۴) مقدمہ/تقریظ کو کمپوز کر کے ارسال کریں۔ (۵) اگر مقدمہ عربی میں ہو تو اس کا اردو ترجمہ بھی ساتھ شامل کریں۔

محمد ناصر سعید اکرمی
ناظم معہد الامام حسن البنا بھٹکل

تعلیم الحدیث

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقام و مرتبہ

مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم النُّجُومُ أَمَنَةٌ لِلسَّمَاءِ، فَإِذَا ذَهَبَتِ النُّجُومُ أَتَى أَهْلَ السَّمَاءِ مَا يُوعَدُونَ، وَأَنَا أَمَنَةٌ لِأَصْحَابِي، فَإِذَا ذَهَبْتُ أَتَى أَصْحَابِي مَا يُوعَدُونَ، وَأَصْحَابِي أَمَنَةٌ لِأُمَّتِي، فَإِذَا ذَهَبَ أَصْحَابِي أَتَى أُمَّتِي مَا يُوعَدُونَ. (مسلم:۲۵۳۱)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: ”ستارے آسمان کے لیے باعث امان ہیں، پس جب ستارے ختم ہوجائیں گے تو آسمان پر وہ چیز آجائے گی جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اور میں اپنے صحابہ کے لیے باعث امان ہوں، پس جب میں دنیا سے چلا جاؤں گا تو میرے صحابہ پر وہ چیز آجائے گی جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اور میرے صحابہ میری امت کے لیے باعث امان ہیں، پس جب میرے صحابہ دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو میری امت پر وہ چیز آجائے گی جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔“

تشریح: یہ حدیث صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مقام و مرتبہ، ان کی دینی خدمات اور امت کے لیے ان کی ناگزیر اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح ستارے آسمان کے لیے امان ہیں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے لیے اور صحابۂ کرام پوری امت کے لیے امان ہیں؛ کیونکہ دین کی حفاظت، سنت کی اشاعت اور امت کی رہنمائی کا عظیم کام اسی مبارک جماعت کے ذریعے انجام پایا۔ ان کے وجود سے حق واضح رہا، سنت محفوظ رہی اور فتنوں کا دروازہ بند رہا۔

قرآنِ مجید نے صحابۂ کرام کی عظمت کو نہایت واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

”مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾“

(محمد اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں مضبوط ہیں اور آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔ تم انہیں رکوع و سجدہ کرتے دیکھو گے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔)

اسی طرح مہاجرین و انصار اور اولین صحابہ کے بارے میں فرمایا: ”وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ“

(مہاجرین وانصار میں سے سبقت لے جانے والے اولین لوگ اور وہ جو نیکی کے ساتھ ان کی پیروی کریں، اللہ ان سب سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔)

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے لیے اپنے گھر چھوڑے، وطن چھوڑا، تجارتیں قربان کیں، رشتہ داروں کی مخالفت برداشت کی، بھوک اور فاقے جھیلے، میدانِ بدر و اُحد میں جانیں ہتھیلی پر رکھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارے پر ہر چیز قربان کردی۔ آج امت کے پاس قرآنِ مجید محفوظ ہے، احادیث کا ذخیرہ محفوظ ہے، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی تفصیلات محفوظ ہیں تو اس کے پیچھے اسی مقدس جماعت کی بے مثال قربانیاں ہیں۔

اسی لیے قرآنِ مجید نے بعد میں آنے والے اہلِ ایمان کو یہ تعلیم دی کہ وہ یہ دعا کریں: ”رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا“

(اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جو ایمان میں ہم سے پہلے گزر چکے ہیں، اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ لوگوں کو صحابۂ کرام کے لیے استغفار کا حکم دیا گیا تھا، لیکن بعض لوگوں نے اس کے برعکس ان پر طعن و تشنیع شروع کردی۔ (صحیح مسلم)

مومن کا راستہ وہی ہے جو قرآن نے سکھایا ہے، یعنی صحابۂ کرام اور سلفِ صالحین کے لیے دعائے مغفرت، محبت اور حسنِ عقیدت۔

فائدہ: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دین کے امین، وحی کے گواہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ شاگرد اور امت کے لیے ہدایت کے روشن مینار ہیں۔ ان کی محبت ایمان کی علامت ہے، ان کا احترام دین کا تقاضا ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا نجات کا راستہ ہے۔ یہی اس حدیث کا مرکزی پیغام ہے کہ امت کی خیر، سلامتی اور دینی استقامت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کو پہچاننے اور ان کے منہج سے وابستہ رہنے میں ہے۔

☆☆☆

تعلیم الفقہ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: کچھ اہل خیر حضرات چاہتے ہیں کہ زکوٰۃ کی رقم سے مکانات تعمیر کرکے غرباء کو دے دیے جائیں، کیا اس طرح مکانات کی تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم استعمال کرنے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی؟

جواب: زکوٰۃ کی رقم سے غرباء کے لئے مکان تعمیر کرنا اور مکان ان کو بلا معاوضہ حوالہ کردینا درست ہے اور اس سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، یعنی غرباء کے لیے زکوٰۃ کی رقم سے مکانات تعمیر کرکے بلا معاوضہ ان کے حوالہ کردینا جائز ہے اور اس سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

سوال: غیر مسلم غرباء کو زکوٰۃ کی رقم دینا درست ہے یا نہیں؟ غیر مسلم بے گھر لوگوں کو اگر زکوٰۃ کی رقم سے مکان بنا کر دیدیا جائے تو اس سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

جواب: زکوٰۃ کی حیثیت عبادت کی ہے اور اس کی ادائیگی کے لیے جو شرائط ہیں، ان میں ایک شرط یہ ہے کہ زکوٰۃ کسی مسلمان غریب کو دی جائے: "تؤخذ من أغنيائهم وتؤتى فى فقرائهم" [صحیح بخاری] یعنی مسلمانوں کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جائے اور ان ہی کے فقراء پر تقسیم کردی جائے، لہٰذا غیر مسلم غریب کو زکوٰۃ دینا درست نہیں اور نہ زکوٰۃ سے ان کو مکان بنا کر دینا درست ہے، بلکہ ان کی امداد صدقات نافلہ سے کرنی چاہیے اور صدقات نافلہ کی رقم سے ان کو مکان بنا کر دینا درست ہے۔

سوال: زکوٰۃ کی رقم سے غریب بچیوں کی شادی کرانا درست ہے یا نہیں؟ آج کل کچھ تنظیمیں اسی مقصد کے لیے قائم ہوتی ہیں، وہ زکوٰۃ جمع کرتی ہیں اور بچیوں کی شادیاں کراتی ہیں، کیا یہ درست ہے؟

جواب: زکوٰۃ وصول کرنے والی تنظیمیں اگر غریب بچیوں یا ان کے اولیاء کو شادی کے لیے زکوٰۃ کی رقم دیدیں اور ان رقوم کو شادیوں میں خرچ کریں تو یہ درست ہے اور زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

سوال: ایک صاحب نسب کے اعتبار سے سید ہیں اور کافی مقروض ہیں، ان کے ایک مالدار دوست ہیں، وہ زکوٰۃ کی رقم سے سید صاحب کے قرض ادا کرنا چاہتے ہیں، کیا اس سے قرض ادا ہوجائے گا؟ اور کیا زکوٰۃ ادا ہوجائے گی؟

جواب: مذکورہ صورت میں قرض ادا ہوجائے گا، لیکن زکوٰۃ دینے والے کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، انہیں چاہیے کہ صدقہ نافلہ سے سید صاحب کے قرض ادا کر دیں اور اپنے مال کی زکوٰۃ دوسرے غرباء ومساکین کو دیں: "ولايدفع الى بنى هاشم وهذا فى الواجبات كالزكوٰة والنذر والعشر فأما التطوع فيجوز الصرف اليهم" [فتاویٰ ہندیہ: ۱/۱۸۹] (سادات بنو ہاشم کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی، اسی طرح نذر وعشر کی رقم نہیں دی جائے گی، بلکہ صدقہ نافلہ اور عطیہ کی رقم ان پر صرف کی جائے گی)۔

سوال: طلبہ کی وہ انجمنیں جو ان کی تقریری اور تحریری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کیلئے قائم کی جاتی ہیں، ان کو زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: جو انجمن صحیح مصرف میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کا انتظام کرے، ان کو زکوٰۃ دینا درست ہے، اگر انجمن کے اراکین غریب طلبہ کی ضروریات اور ان کے مصارف میں صرف کریں تو ان کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

سوال: چند مسلمانوں نے طبی امداد کے لیے ایک فنڈ قائم کیا ہے، اس میں زکوٰۃ کی رقمیں جمع کی جاتی ہیں تاکہ مریضوں کی طبی امداد کی جائے، کیا اس فنڈ میں زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اور دینے سے زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں، طبی امداد میں دوا، چیک اپ اور دیگر اخراجات شامل ہیں۔

جواب: اگر غریب مریضوں کی طبی امداد اس فنڈ سے کی جائے تو اس میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے مستحق کو رقم دینا ہی ضروری نہیں، بلکہ اس رقم سے دوا یا دیگر طبی سہولیات فراہم کی جاسکتی ہیں: "ويجزيه أن يعطى من الواجب جنساً آخر من المكيل و الموزون أو العروض أو غير ذلك بقيمته" [مبسوط للسرخسی: ۱/۲۰۳] (زکوٰۃ میں جو چیز واجب ہو، اس کے عوض دوسری چیزیں دی جاسکتی ہیں، جیسے رقم کے بدلے کیلی، وزنی سامان یا دیگر اشیاء دی جائیں)۔

سوال: اگر دواخانہ کے مالک صاحب نصاب ہوں، وہ اپنی زکوٰۃ کی رقم کے بدلہ غریب مسلمانوں کو بغیر کسی عوض کے دوا دیدیں، تو کیا اس سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا نہیں؟

جواب: اگر غریب مسلمان کو زکوٰۃ کی رقم کے عوض دوا دیدیں تو اس سے بھی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

سوال: زکوٰۃ کی رقم رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ جیسے کنواں بنوادینا، ہنڈ پائپ لگادینا یا عام مشورے کے لیے پنچایت گھر بنوانا وغیرہ؟

جواب: مذکورہ چیزوں میں زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا درست نہیں ہے، ہاں! اگر غریبوں کو زکوٰۃ کی رقم دے دی جائے اور وہ اپنی خوشی سے مذکورہ چیزوں میں صرف کردیں، تو یہ درست ہے۔

[فتاویٰ ہندیہ: ۲/۴۷۳]

☆☆☆

فرزندندوہ

ایک منفرد عالم و محقق

مولانا حاجی سید معین الدین ندویؒ

مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی (دہلی)

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فرزندان میں مولانا حاجی معین الدین ندوی کی شخصیت بڑی حد تک مستور ہے۔ ایسا دو وجہوں سے ہے۔ ایک تو یہ کہ اُن کا اصل تحقیقی کام اس نوعیت کا ہے کہ اس سے رجوع کی نوبت اہلِ علم کو بھی کم ہی آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ علمی دنیا میں اُنھیں اور اُن کے ہم نام رفیق، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ ''حاجی'' اور ''شاہ'' کے فرق کو ملحوظ رکھنے اور دونوں کی شخصیت اور کام کو الگ الگ سمجھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی جاتی۔ کیوں کہ شاہ معین الدین کے مقابلے میں حاجی معین الدین کا تصنیفی کام اردو زبان میں کم ہے، اس لیے اُن کی طرف ذرا کم ہی توجہ کی جاتی ہے۔

چنانچہ اردو کتب و رسائل کی سب سے بڑی ویب سائٹ ریختہ پر حاجی صاحب کے نام کا خانہ ہی موجود نہیں ہے۔ اُن کی تصانیف کو شاہ صاحب کے خانے میں ہی ڈال دیا گیا ہے۔ اور تو اور، ان دونوں بزرگوں کے ناموں میں دارالمصنّفین، اعظم گڑھ کے اراکین کو بھی التباس ہوگیا ہے۔ چنانچہ وہاں سے شائع ہونے والی کتاب ''مہاجرین'' کی جدید طباعت میں دونوں جلدوں کے سرورق پر حاجی صاحب کا نام لکھا ہے، حالاں کہ اس کی پہلی جلد حاجی صاحب کی اور دوسری جلد شاہ صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ خواص و عوام کی اس بے توجہی کے باوجود سچ یہی ہے کہ اپنے اصل کام کی نوعیت کے لحاظ سے صرف ابنائے ندوہ میں نہیں، ہندستان کے اسلامی محققین میں بھی حاجی سید معین الدین ندوی کی مثال ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔

مولانا حاجی معین الدین ندوی ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں استھاواں، بہار میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید جان محمد تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا انتقال ہوگیا تھا، اس لیے اپنی نانی کے زیرِ سایہ پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں داخل کیے گئے۔ پندرہ سولہ سال کے ہوئے تو ۱۹۰۸ء میں نانی جان کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔ اُس دور میں ایسا کم ہی ہوتا تھا، اس لیے ''حاجی صاحب'' کے لقب سے معروف ہوئے۔ پھر یہ لقب علمی دنیا میں بھی اُن کے نام کا لاحقہ بن گیا۔ اپنی صالحیت وصلاحیت کی وجہ سے اساتذہ کے منظورِ نظر اور طلبہ میں ممتاز رہے۔ اسی لیے اُن کے استاد و مربی علامہ سید سلیمان ندوی نے اُن کو ''مجموعۂ فضل و کمال واخلاق'' جیسے عالی خطاب سے یاد کیا ہے۔

۱۹۱۲ء کے اواخر میں مولانا حاجی معین الدین ندوی نے دارالعلوم سے تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۱۴ء میں شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے دنیا سے رحلت فرمائی تو اُن کے جانشین، سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی نے استاد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرتے ہوئے اعظم گڑھ میں دارالمصنّفین کی بنیاد رکھی۔ اس عظیم ادارے کے لیے جن دو شخصیات کو سب سے پہلے رفیقِ علمی کے طور پر منتخب کیا گیا، اُن میں ایک مولانا عبدالسلام ندوی تھے اور دوسرے مولانا حاجی معین الدین ندوی۔ کسی بھی ادارے کے اولین اراکین کا انتخاب نہایت باریک بینی سے کیا جاتا ہے، کیوں کہ وہی اراکین ادارے کے لیے اساس کا کام دیتے ہیں۔ لہٰذا دارالمصنّفین کے اولین رفیقِ علمی کے طور پر جن افراد کا انتخاب ہونا تھا، اُن کا علمی معاملات میں علامہ شبلی نعمانی کا ہم مزاج و ہم ذوق ہونا بھی ضروری تھا اور علامہ سید سلیمان ندوی کے معیار پر کھرا اترنا بھی۔ اس لیے مولانا حاجی معین الدین ندوی کا اولین رفیقِ علمی منتخب ہونا، جوانی ہی میں اُن کی علمی پختگی، تحقیقی بلندی اور ادبی خوش ذوقی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ حاجی صاحب کے انتخاب میں یقیناً یہ عامل بھی رہا ہوگا کہ وہ علامہ شبلی نعمانی کے محبوب تلامذہ میں شامل تھے۔ اسی لیے علامہ شبلی نے الندوۃ کے فروری ۱۹۱۲ء کے شمارے میں ''حرمِ نبوی'' کے موضوع پر حاجی صاحب کا ایک مضمون بھی شائع فرمایا تھا، حالاں کہ وہ اُس وقت ندوے کے طالبِ علم تھے۔ اسے اُن کا پہلا مطبوعہ مضمون بھی کہا جاسکتا ہے۔ ''مکاتیبِ شبلی'' میں حاجی صاحب کے نام بھی دو خطوط شامل ہیں۔

مولانا حاجی معین الدین ندوی جب دارالمصنّفین پہنچے تو ''سیرۃ النبی'' کے بعد سب سے پہلے اور سب سے اہم علمی و تحقیقی منصوبے ''سیر الصحابہ'' کا حصہ بنے۔ ''سیرۃ النبی'' کی ترتیب و تصنیف کا منصوبہ پورا کا پورا علامہ سید سلیمان ندوی سے متعلق تھا، لیکن ''سیر الصحابہ'' کا منصوبہ

مختلف محققین میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان میں سے سب سے پہلا کام، یعنی خلفائے راشدین اور باقی مہاجرین کے حالات کی تحقیق و ترتیب کا کام، مولانا حاجی معین الدین ندوی کے حصے میں آیا۔ چنانچہ اس ذیل میں اُن کی دو تصانیف ''خلفائے راشدین'' اور ''مہاجرین'' (اوّل) منظرِ عام پر آئیں۔ سیرتِ نبوی کے ایک حقیر طالبِ علم کی حیثیت سے ہمارا احساس ہے کہ ''مہاجرین'' پر لکھا ہوا اُن کا مقدمہ خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۷۵ صفحات پر مشتمل اس وقیع مقدمے میں ہجرت اور مہاجرین کے متعلق جو نفیس معلومات حسنِ ترتیب کے ساتھ جمع کر دی گئی ہیں، وہ معلومات ہجرت کے متعلق لکھی گئی اکثر کتابوں میں بھی اتنے جامع انداز میں نہیں ملتیں۔ مصنفِ گرامی کی تحقیقی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اُنھوں نے ایک صدی قبل کتب و وسائل کی سخت قلت کے باوجود اتنا گراں قدر مقدمہ تحریر فرمایا۔ ہم اسے اردو زبان میں ہجرت و مہاجرین کے متعلق اولین علمی دستاویز بھی کہہ سکتے ہیں۔

۱۹۱۸ء میں مولانا حاجی معین الدین ندوی کو مخطوطات کی فہرست سازی کے لیے ندوۃ العلماء بلایا گیا۔ وہاں رہ کر اُنھوں نے یہ پتہ ماری کا کام ایسی تن دہی کے ساتھ کیا کہ مخطوطات کی شناخت، خواندگی اور فہرست سازی ہی اُن کی پہچان بن گئی۔ ملک کے اہم ترین علمی مراکز نے اُن سے استفادہ کیا اور اُن کا یہ کام یورپ کے اہلِ علم کے درمیان بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ دو سال ندوے میں قیام کرنے کے بعد وہ ۱۹۲۱ء میں بوہار لائبریری، کلکتہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے۔ دو سال قیام کر کے وہاں عربی و فارسی کتابوں کی شناخت اور فہرست سازی کا کام انجام دیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں بانکی پور اورینٹل پبلک لائبریری نے اُنھیں اپنے ہاں بلا لیا۔ یہاں حاجی صاحب نے انگریزی زبان میں مخطوطات کی فہرست پر مبنی سات جلدیں ترتیب دیں۔ لائبریری کے مخطوطات کا یہ مکمل سیٹ ۳۶ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے Biography (سوانح) پر مبنی جلد نمبر ۱۲، History (تاریخ) پر مبنی جلد نمبر ۱۵، Quranic Science (قرآنی علوم) پر مبنی جلد نمبر ۱۸ اور جلد نمبر ۳۶، Philology (فقہ اللغۃ) پر مبنی جلد نمبر ۲۰، Poetry and Elegant Prose (شاعری اور فصاحت و بلاغت) پر مبنی جلد نمبر ۲۳، اور Ethics and Prayer (اخلاقیات و عبادات) پر مبنی جلد نمبر ۲۴ مولانا حاجی معین الدین ندوی نے تیار کیں۔ ہر جلد اوسطاً سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سب اُن کی زندگی ہی میں منظرِ عام پر آ چکی تھیں۔

۱۹۳۲ء میں اُنھیں بادلِ نخواستہ وہاں سے سبک دوش ہونا پڑا۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی زندگی کے باقی چند برسوں میں اُنھیں ملک کے دو عظیم تحقیقی مراکز سے بھی گزارنا چاہتا تھا، تاکہ ملک کے ممتاز ترین علمی و تحقیقی اداروں میں اُن کے نقوشِ قدم تادیر باقی رہ سکیں۔ اسی لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سبک دوش ہو کر ۱۹۳۳ء میں دائرۃ المعارف، حیدرآباد پہنچے۔ وہاں کے ایک سالہ قیام کے دوران اُن کا سب سے نمایاں کام ''معجم الأمكنة التى لها ذكر فى نزهة الخواطر'' کی تصنیف ہے۔ ہندستان کے تقریباً تمام تاریخی مسلم شہروں کے جامع تعارف پر مشتمل یہ کتاب ۱۳۵۳ھ میں علامہ سید سلیمان ندوی کی تقریظ کے ساتھ حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ یہاں سے ۱۹۳۴ء میں رضا لائبریری، رام پور پہنچے۔ وہاں بھی ایک سال قیام کیا۔ مخطوطات کی خدمت کے ساتھ ''طبقاتِ اکبری'' پر انگریزی حواشی بھی قلم بند فرمائے۔ ۱۹۳۵ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں پرنسپل کی حیثیت سے پہنچے۔ انتظامی ذمے داریوں کے ساتھ صحیح بخاری کی تدریس بھی انجام دیتے رہے۔ آخر اسی مبارک مشغلے کو انجام دیتے ہوئے ۱۹۴۱ء میں اچانک ۴۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس منفرد عالم و محقق کی ناگہانی موت پر علمی دنیا تڑپ کر رہ گئی۔ مولانا مسعود عالم ندوی نے خط کے ذریعے علامہ سید سلیمان ندوی کو اس حادثے کی خبر دی تو اُنھوں نے جواب میں لکھا:

''آپ کا خط ملا۔ حاجی صاحب کے سانحے کی خبر نے دل پر کاری ضرب لگائی۔ ابوالحسنات مرحوم اور عبدالرحمان نگرامی مرحوم سے لے کر حاجی صاحب تک جو واقعات پیش آئے، اُن سے دل کو یہ وسوسہ ہے کہ میری محبت خود زہر کا پیالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو مغفرت سے نوازے۔

میرا سینہ ہے، الٰہی! یہ چراغاں تو نہیں۔''

ضرورت ہے کہ عربی، اردو اور انگریزی زبانوں میں موجود مولانا حاجی سید معین الدین ندوی کے علمی سرمائے سے بھرپور استفادہ کیا جائے اور اُن کی علمی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

☆☆☆

فکرونظر

ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آفاقی وابدی پیغام

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء)

نئے سالِ ہجری کے شروع ہوتے ہی ذہن ودل کے نہاں خانوں میں رنج وغم کی داستانوں اور اشک و الم کی یادوں کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں، اور کبھی ہجرت اور کبھی اجتماعی وسیاسی امور ومصالح کے رموز و معانی کی پُرنور تصویریں نگاہوں کو خیرہ کرنے لگتی ہیں۔ صفحاتِ تاریخ پر کچھ ایسی ہجرتیں منقش نظر آتی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر عزیمت و بصیرت کے متوالوں نے ہجرتِ نبوی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ یہ ہجرت ایک ایسا اسٹیج ہے جس سے ان اعلیٰ اخلاق اور بلند و بالا صفات کی اشاعت وترویج ہوئی جن سے اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سرفراز فرمایا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ایک ایسا چشمۂ حیواں ہے جس کی شرابِ طہور کا جام چڑھا کر عزت وشرافت کے اعلیٰ مدارج کو طے کیا گیا، اور ہر اس ہجرت کا وہی حال رہا ہے جس کی آبیاری خالص عقیدۂ توحید کے آبِ حیات سے ہوتی تھی اور جس کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا: ”اِعلاءِ کلمۃ اللہ اور حصولِ رضائے الٰہی“۔ ان عظمتوں اور بلندیوں کی شاہکار ہجرت نے قبولیت اور قدر و منزلت کے اس مقام کو حاصل کر لیا جن سے وہ تمام ہجرتیں محروم رہیں جنہوں نے محض نفسانی خواہشات اور حقیر اغراض ومقاصد کو پیشِ نظر رکھا۔ اس ہجرتِ عظیم کے محل کی بنیاد خالص نیک نیتی، بلند حوصلگی اور اعلیٰ مقاصد پر موقوف ہے، اور یقیناً یہ حدیث اسی مفہوم کی غمازی کر رہی ہے:

”إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى الله ورسوله فهجرته إلى الله ورسوله، ومن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها أو امرأة ينكحها فهجرته إلى ما هاجر إليه“۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: تمام اعمال کا دار و مدار نیتوں پر موقوف ہے، لہٰذا جس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے لیے ہوگی، اور جس شخص نے حصولِ دنیا کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا ہے۔ (بخاری ومسلم)

ہمیشہ سے ہی یہ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کی توجہ و التفات کا مرکز رہی ہے اور میدانِ علم وعمل میں ایک کلیدی حیثیت کی مالک رہی ہے، اور علماءِ دین اور مصلحین امت نے ریا و نمائش اور نام ونمود کے شائبوں سے نفس کو پاک کرنا، اخلاص وللّٰہیت اور محبت و الفت جیسے بیش قیمت معانی، نادر و نایاب ایمانی وروحانی مفاہیم و مطالب کا استنباط کیا ہے۔ اور صرف یہی نہیں، بلکہ یہ رنگا رنگ صفات وکمالات کا مجموعہ، خالص دینی و تربیتی خیالات و تصورات اور مختلف اسلامی امتیازات وخصوصیات کا حسین ودلکش مرقع اور ایک مقدس ترین اصطلاح بن چکا ہے، جو قرونِ اولیٰ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں جاگزیں اور ان کے قلب وروح میں رچ بس گئی تھی، اور ان کے ذہن ودماغ کے دریچوں میں سرایت کر گئی تھی، جنہوں نے ہجرت کے مفاہیم و معانی کو ثابت کر کے اس کی عملی تصویر پیش کی تھی۔

اور جنہوں نے محض اِعلاءِ کلمۃ اللہ اور خالص عقیدۂ توحید کی نشر واشاعت کے لیے ان دور دراز ممالک کی طرف، جو شرک وبت پرستی اور ضلالت و گمراہی کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے، ہجرت کی، جیسے ہندوستان، چین، مالدیپ، ملیشیا اور انڈونیشیا وغیرہ۔ ان ممالک کی طرف ان بزرگوں کی ہجرت کا مقصد محض حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کرنا تھا، اور ایسا واقعہ قرونِ اولیٰ کی پہلی دہائی میں اس وقت پیش آ چکا تھا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مع اپنے صحابہ کے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی۔ اگر اللہ اور اس کے رسول کی خالص محبت واخلاص پر اس ہجرت کی بنیاد نہ ہوتی اور رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ”فمن كانت هجرته إلى الله ورسوله فهجرته إلى الله ورسوله“ کا مصداق نہ ہوتی تو اس کرۂ ارض پر عقیدۂ توحید اور ایمان ویقین کی شاخوں میں اسلامی دعوت کی نشر و اشاعت کی صورت میں جو برگ و بار اور بہار آئی ہوئی ہے، وہ ظہور پذیر نہ ہوتی، اور یہ انسانی معاشرہ ایک صحیح اسلامی معاشرہ میں تبدیل نہ ہوتا، جس میں عدل وانصاف، مساوات، رحمدلی، محبت ووفاداری، عفت وامانت، ایثار، خودشکنی، ہمدردی وغم خواری اور جذبۂ خدمت جیسے بلند مفاہیم کے نادر نمونے اور اعلیٰ اخلاقی اقدار، جو حقیقی سعادت کے ضامن ہیں، جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

تاریخِ اسلام کے مختلف ادوار میں ہجرت ومحبت اور جاں نثاری وجاں بازی کے جو نادر نمونے پیش آئے اور ان میں اخلاقی شجاعت وجواں مردی اور پختہ عقیدۂ توحید کا جو ظہور ہوا، دعوتِ اسلامی کی تاریخ میں ان کا ریکارڈ اچھی طرح محفوظ ہے۔ ان وقفوں میں پختہ

ایمان ویقین کا ظہور ان لازمی خیرہ کن نتائج کے ساتھ ہوا جن سے اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والے مصلحین و مجددین کو اِعلاء کلمۃ اللہ اور شریعتِ اسلامیہ کی تقویت اور کفر وضلالت اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں دوچار ہونا پڑا۔

اس لیے کہ ہجرت کے اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے ایک مومن مہاجر کبھی بھی اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ راہِ حق میں کیا مصائب پیش آئیں گے اور اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔ وہ تو اپنے آپ کو عقیدۂ توحید کے استحکام میں فنا کر دیتا ہے اور اپنی جان، مال، عزت، آبرو اور اپنے سارے وسائل و ذرائع اور مستقبل کو اللہ کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ ان چیزوں کے ذریعے عوام کے دلوں میں اعلیٰ اقدار اور بیش بہا مقاصد کو جما دیتا ہے اور ان کے عقلی وعلمی معیار کو معاشرہ اور زندگی کے تمام امور میں بہت بلند کر دیتا ہے۔

انہی بنیادوں پر علماءِ دین اور فقہاء کی ایک بڑی تعداد نے مسلمانوں کی ہجرت کو دارالکفر سے کسی ایسے ملک کی طرف فرض قرار دیا ہے جہاں پر مذہبِ اسلام کو عزت وعظمت اور سربلندی وبرتری حاصل ہو، لیکن اس ہجرت کا مسئلہ فقہِ اسلامی کے ماہرین اور اسلامی مفکرین ودانشوروں کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔ اس موضوعِ بحث میں بعض حضرات نے شدت سے کام لیا ہے، خاص طور پر ان حالات میں جن میں ذمہ داری کو نبھانا اور شعائرِ اسلام پر عمل کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور مسلمان مختلف قسم کی آزمائشوں سے دوچار ہو جاتے ہیں، اور صحیح عقیدہ وایمان پر جمے رہنا اور مذہبی شعائر کا اظہار دشوار ہو جاتا ہے، بلکہ استیصال ونسل کشی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انہیں ہر وقت اور ہر لمحہ تباہی و بربادی اور ضیاع کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

اور ان کی نگاہوں کے سامنے حبشہ کی جانب ہجرت کی تصویریں گردش کرنے لگتی ہیں، جس دن نہ اپنا کوئی وطن تھا اور نہ کوئی حکومت تھی، مگر یہ جذبۂ ایثار اور شوقِ جہاد محض راہِ خدا میں ہجرت و جہاد کی ادائیگی، سنت پر عمل، اِعلاء کلمۃ اللہ اور حدود واحکامِ شرعیہ کے اجرا ونفاذ کے لیے تھا۔ اسی جذبۂ قربانی اور شوقِ جہاد نے دورِ اخیر کے بعض غیور، صاحبِ ایمان اور شوقِ جہاد سے سرشار دلوں کو مضطرب و بے چین کر دیا تھا۔

ان مجددین و مصلحین میں اخیر دور میں امیر عبدالقادر الجزائریؒ اور ان کے تربیت یافتہ علماء و صلحاء، اور اسی طرح اٹلی کے خلاف جنگِ طرابلس کے روحِ رواں سید احمد شریف سنوسیؒ اور ان کے تربیت یافتہ صلحاء، اور پھر ہندوستان میں سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء وخلفاء کی جماعت، یہ وہ مبارک ہستیاں ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی راہِ حق میں جہاد وہجرت کے اندر گزاری اور اس بیعِ ربانی کا سچا نمونہ پیش کیا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں سے فرمایا ہے: ”إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ“ (توبہ: ۱۱۱) (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، جس میں قتل کرتے ہیں اور کبھی قتل کیے جاتے ہیں۔ اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں، انجیل میں اور قرآن میں، اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے؟ تو تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے معاملہ ٹھیرایا ہے خوشی مناؤ، اور یہ بڑی کامیابی ہے۔)

ہجرت وجہاد کے یہ واقعات ہجرت وجہاد کے گہرے مفہوم سے وابستہ ہیں اور اس کے واقعات ومناظر اس شخص کے ذہن ودماغ میں گردش کرنے لگتے ہیں جو ان کا ان دلائل کی روشنی میں تجزیہ کرتا ہے جو خالص عقیدۂ توحید کے منبع ہیں، اور اسی سے اس ہجرت کے مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے جو خالص عقیدۂ توحید پر مبنی ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادِ گرامی کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اسی کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے:

”وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقاً حَسَناً وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ★ لَيُدْخِلَنَّهُم مُّدْخَلاً يَرْضَوْنَهُ وَإِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيمٌ حَلِيمٌ“ (الحج: ۵۹-۵۸)

(اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، پھر شہید ہو گئے یا فطری موت مرے، تو اللہ ان کو اچھا رزق دے گا، اور اللہ تعالیٰ اچھا رزق دینے والا ہے، اور ان کو پسندیدہ ٹھکانا دے گا، اور اللہ جاننے والا، حلیم ہے۔)

یہ ہجرت ایک خالص اسلامی سرچشمہ ومنبع ہے، جس کی بنیاد ایمان ویقین پر ہے۔ اس کو غیر مسلم طاقتوں نے حقیر اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے اختیار کیا تاکہ مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیں، اور جیسے جیسے ہماری غفلت اس کی طرف سے بڑھتی جا رہی ہے ویسے ویسے دشمنانِ اسلام کے پنجے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللّٰهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ“۔ (النحل: ۴۱)

(اور جن لوگوں نے ظلم وستم ڈھائے جانے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر اس سے بڑھ کر ہے، اگر وہ جانیں۔)

☆☆☆

نجوم تاباں

زندگیاں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی...

مولانا محمد جعفر مسعود حسنی ندویؒ (سابق ناظر عام ندوۃ العلماء)

کچھ نمونے آج آپ کی خدمت میں صحابۂ کرامؓ کے۔ کیسی تھی ان کی زندگی، کیا تھے ان کے حالات، کتنا تھا ان کے یہاں اہتمام عبادتوں کا، کتنا تھا خیال ان کو سنتوں کی اتباع کا، کتنی تھی فکر ان کو آخرت کی اور کیا حیثیت تھی ان کی نظروں میں دنیا کی؟!

دل ان کے کتنے صاف تھے، زبان ان کی کتنی پاک تھی، عزائم ان کے کتنے بلند تھے، خیالات ان کے کتنے اعلیٰ تھے، زندگی ان کی کتنی سادہ تھی، نظریں ان کی کتنی پاکیزہ تھیں، آخرت کی فکر ان پر کتنی غالب تھی، دنیا کا خوف ان پر کتنا طاری تھا، اخلاق کا ان کے کیا عالم تھا، نیتوں کا ان کی کیا معیار تھا؟!

بزرگوں کی بزرگی اپنی جگہ، اولیاء کی ولایت کا اپنا مرتبہ، اور صحابیت کا شرف تو اس کا کہنا ہی کیا، دیکھیے زبانِ نبوت ان کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ ''میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے۔''

''میں نہیں جانتا کہ اب کتنی مدت مجھ کو تمہارے درمیان رہنا ہے۔ چنانچہ میرے جانے کے بعد میرے بعد آنے والوں کی اقتدا کرنا (اور آپ ﷺ نے یہ کہتے ہوئے اشارہ فرمایا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی طرف) اور عمار بن یاسر کے راستے پر چلنا اور عبداللہ بن مسعودؓ جو کچھ تم سے کہیں اس پر یقین کرنا۔''

آیئے! اب دیکھیں قرآنِ کریم میں صحابۂ کرام کا تذکرہ کس انداز میں ملتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: {وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ} (وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں، ان کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کا نقصان ہی کیوں نہ ہو)۔

ایثار و قربانی کے ایک دو نمونے ملاحظہ ہوں:

رات کا وقت ہے، حضرت طلحہؓ کا مکان ہے، کھانے کی تیاری ہے، اچانک ایک مہمان آتا ہے، کھانا اتنا مختصر کہ خود کھالیں یا مہمان کو کھلا دیں۔ بیوی سے کہتے ہیں، بچوں کو کسی طرح سلا دو، اور چراغ گل کر کے کھانا مہمان کے آگے لگا دو۔ بیٹھیں گے ہم بھی، لیکن کھانے کے لیے نہیں، صرف یہ تاثر دینے کے لیے کہ کھانے میں ہم بھی شریک ہیں۔ کھانا کم ہے، اگر ہم بھی شریک ہو گئے تو مہمان کا پیٹ نہیں بھر پائے گا۔ چراغ گل کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ مہمان شکم سیر ہو کر کھائے گا اور اسے یہ احساس نہیں ہو پائے گا کہ ہم نے کھانا نہیں کھایا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روزے سے ہیں، گھر میں صرف ایک روٹی ہے جو افطار کے لیے بچا کر رکھی گئی ہے۔ دروازے پر سائل صدا لگاتا ہے۔ خادمہ کو حکم ہوتا ہے کہ روٹی اس کو دے دی جائے۔ خادمہ نے عرض کیا کہ آپ روزے سے ہیں، سحری بھی بہت مختصر تھی، بغیر افطار کے آپ رات کیسے گزاریں گی؟ حکم ہوتا ہے پھر بھی دے دو۔ {تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ} (ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں)۔

حضرت علیؓ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ ضرار بن ضمر کہتے ہیں، رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا، آسمان پر چمکتے ستارے بھی اپنے چہرے پر سیاہ نقاب ڈال چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ مسجد کی محراب میں کھڑے تڑپ رہے ہیں، بلک بلک کر رو رہے ہیں، گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے ہیں اور دنیا کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں: اے دنیا! میں نے تجھ کو تین طلاق دیں، تعلقات کی بحالی کا اب کوئی امکان نہیں، تیری عمر بہت مختصر، تیری زندگی بہت معمولی اور تیرا خطرہ بہت بڑا ہے۔ آہ! سفر کتنا طویل ہے، راستہ کتنا ویران ہے، اور زادِ سفر کتنا مختصر ہے۔

حضرت علیؓ کون ہیں؟ آپؐ کے چچازاد بھائی ہیں، چہیتے داماد ہیں، ایمان لانے والے خوش نصیب بچوں کی فہرست میں سب سے اوپر آپ کا نام ہے، لیکن حال پھر بھی یہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں، مسجد کے ایک گوشے میں، تنہائی کی حالت میں ربِ کریم کے سامنے گریہ وزاری کا یہ عالم ہے کہ سننے والے کا دل پھٹا جاتا ہے۔

{أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ}

(وہ کفار کے مقابلے میں سخت ہیں)۔

کفار کے مقابلے میں صحابۂ کرام کا سخت ہونا ہر ہر موقع پر ثابت ہوتا رہا ہے۔ صلحِ حدیبیہ کے موقع پر تو خصوصیت سے صحابۂ کرام کی اس صفت کا اظہار ہوا، باقی اس کی سب سے اعلیٰ مثال تو اس موقع پر سامنے آتی ہے جب بدر کے قیدیوں کا معاملہ صحابۂ کرام کے سامنے لایا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، رائے کے اظہار کا سب کو موقع دیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جب باری آتی ہے تو وہ کہتے ہیں: حضور! آپ مجھے اجازت دیں کہ ان قیدیوں میں اپنے سب سے قریبی رشتہ دار کا سر اپنی تلوار سے قلم کروں، حضرت علیؓ کو حکم

دیں کہ وہ اپنے بھائی عقیل بن ابی طالب کا سر تن سے جدا کریں، حضرت حمزہؓ کو اشارہ کریں کہ وہ ان قیدیوں میں سے اپنے بھائی کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھائیں۔

{رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ}

(وہ آپس میں بڑے مہربان ہیں)

انصار اور مہاجرین کے درمیان ہوئی مواخات ''رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ'' کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ انصار نے اپنی ہر چیز میں مہاجرین کو شریک ہونے کی دعوت دی، مکان میں ان کو شریک کیا، جائیداد میں ان کو حصہ دار بنایا، کاروبار میں ان کو شامل کیا، یہاں تک کہ جن کے پاس ایک سے زائد بیویاں تھیں انہوں نے مہاجرین کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ اگر وہ ان میں سے کسی کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں تو ان کی خاطر وہ اپنی اس بیوی کو طلاق دے سکتے ہیں تاکہ وہ اس سے نکاح کر سکیں، اور یہ سب انہوں نے صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر کیا۔

اب آیئے کچھ نمونے ملاحظہ کیجیے واقعات کی روشنی میں۔

عبادات کا اہتمام دیکھیے:

نماز کا وقت ہے، کسی وجہ سے نماز میں تاخیر ہو گئی تو اس کی سزا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے نفس کو اس طرح دی کہ دو لاکھ درہم کا ایک باغ، جو انہیں بہت عزیز تھا، صدقہ کر دیا۔

ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ بھی ایک مرتبہ اسی طرح واقعہ پیش آیا تو انہوں نے اس کی تلافی کی شکل یہ نکالی کہ اس دن پوری رات نماز پڑھتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

احتیاط کا عالم دیکھیے:

حضرت عمر فاروقؓ گشت فرما رہے تھے۔ راستے میں آپ کا گزر اونٹوں کی ایک چراگاہ سے ہوا۔ ایک اونٹ آپ کو دوسرے اونٹوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی فربہ نظر آیا۔ پوچھا: یہ اونٹ کس کا ہے؟ لوگوں نے بتایا: آپ کے صاحبزادے عبداللہ کا۔ یہ سننا تھا کہ آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فوراً عبداللہ بن عمر کو طلب کیا اور ان سے دریافت کیا: یہ اونٹ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ انہوں نے جواب دیا: یہ اونٹ میں نے خریدا تھا اور اپنے پیسے سے خریدا تھا۔ اس وقت یہ کمزور اور لاغر تھا۔ میں نے اس کو چراگاہ میں دوسرے اونٹوں کے ساتھ چرنے کے لیے بھیج دیا۔ دھیرے دھیرے یہ فربہ ہوتا گیا۔ میرا ارادہ اس کو بیچ کر کچھ نفع حاصل کرنا تھا۔

حضرت عمرؓ کو یہ سن کر جلال آ گیا۔ آپ نے فرمایا: اس عوامی چراگاہ میں جب تمہارا اونٹ چرنے کے لیے آئے گا تو لوگ یہ سوچ کر کہ یہ خلیفۃ المسلمین کے صاحبزادے کا اونٹ ہے، اس کا خاص خیال رکھیں گے، پہلے تمہارے اونٹ کو چرنے دیں گے، پہلے تمہارے اونٹ کو پانی پلائیں گے۔ اس طرح تمہارا اونٹ ان کے اونٹوں سے جلدی فربہ ہوگا، اور اس کی قیمت ان کے اونٹوں سے زیادہ لگے گی۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے صاحبزادے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے عبداللہ! اس اونٹ کو بیچ دو، جتنی رقم میں تم نے اس کو خریدا تھا وہ رقم اپنی لے لو، اور باقی زائد رقم بیت المال میں جمع کر دو، کیونکہ وہ تمہارا حق نہیں۔

اتباعِ سنت کا حال سنیے:

صحابۂ کرام جمع ہیں، مشورہ ہو رہا ہے، معاملہ تدوینِ قرآن کا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جب یہ مسئلہ لایا جاتا ہے تو آپ کی زبان سے یہ جملہ نکلتا ہے: میں وہ کام کیسے کروں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ لیکن پھر صحابۂ کرام کی رائے کو درست سمجھ کر آپ نے اس عظیم الشان کام کی اجازت مرحمت فرمائی۔

منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو اعلانات کیے، ان میں سب سے پہلا اعلان یہ تھا: میں وہی کام کروں گا جو آپؐ کر کے دکھا گئے یا کرنے کا حکم دے گئے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش کیا جاتا، اور واضح طور پر کوئی نمونہ اس سلسلے میں حیاتِ طیبہ کا آپ کے سامنے نہ ہوتا تو آپ صحابۂ کرام کے پاس تشریف لے جاتے، ایک ایک سے ملتے، اور اس معاملے کے سلسلے میں نبوی طریقہ دریافت کرتے، اور جب آپ کے سامنے اس سلسلے میں حضور اقدسؐ کا طریقہ بیان کیا جاتا تو فرماتے: اللہ کا شکر ہے کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ہمارے نبی محمدؐ کی سنتوں کے محافظ ہیں۔

حبِ رسول کا نمونہ ملاحظہ ہو:

مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کا ایک خط حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں پہنچتا ہے۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح ہے:

دو گانے والی عورتوں نے ایک گانا گایا۔ ان میں ایک اپنے گانے میں اشعار کے ذریعے آقائے نامدار حضرت محمدؐ کی شان میں گستاخی کی، جب کہ دوسری نے اپنے گانے میں مسلمانوں کو ہجو کا نشانہ بنایا۔ اس کی سزا میں نے ان کو یہ دی کہ ان دونوں کے ہاتھ قلم کروا دیے اور سامنے کے دانت اکھڑوا دیے تاکہ آئندہ وہ گانے کے لائق نہ رہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس فیصلے کو غلط قرار دیا اور اپنی نرم مزاجی اور رحم دلی کے باوجود لکھا کہ حضورؐ کی شان میں گستاخی کرنے والی وہ بدزبان عورت قتل کی مستحق تھی، اور مسلمانوں کو ہجو کا نشانہ بنانے والی عورت معافی کی حقدار تھی۔

☆☆☆

یادِ رفتگاں

مولانا ڈاکٹر محمد شعیب نگرامی ندویؒ

علم ومحبت کا روشن چراغ نہ رہا

مولانا محمد فیضان نگرامی ندوی (انچارج علامہ شبلی نعمانی لائبریری، ندوۃ العلماء)

بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کے جانے سے صرف ایک فرد کی جدائی محسوس نہیں ہوتی بلکہ ایک پورا عہد ختم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی زندگی میں ہی محبت، علم، خلوص اور وقار کی ایسی روشن مثال بن جاتے ہیں کہ ان کی موجودگی خاندان، احباب اور علمی حلقوں کے لیے ایک نعمت محسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر شعیب نگرامیؒ کی رحلت ہمارے لیے ایسا ہی ایک عظیم سانحہ ہے۔ ان کے انتقال کی خبر نے دل کو گہرے غم میں مبتلا کر دیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے علم ومحبت کا ایک روشن چراغ اچانک بجھ گیا ہو اور اس کی روشنی سے وابستہ بے شمار دل اداسی میں ڈوب گئے ہوں۔ آج بھی یقین نہیں آتا کہ وہ محبت بھرا چہرہ، وہ سنجیدہ مگر دل نشیں گفتگو، وہ شفقت آمیز لہجہ اور وہ حوصلہ دینے والی شخصیت اب ہمارے درمیان موجود نہیں رہی۔

ڈاکٹر شعیب نگرامیؒ اس سرزمین نگرام کے فرزند تھے جسے اللہ تعالیٰ نے صدیوں سے علمائے ربانیین، اہلِ علم اور مشائخِ عظام کی نسبتوں سے عزت بخشی ہے۔ نگرام کی مٹی ہمیشہ علم وعرفان کی خوشبو سے معطر رہی ہے۔ اس بستی نے ایسے علماء، مفسرین، محدثین، فقہاء، ادباء اور اہلِ دل پیدا کیے جنہوں نے اپنے علم، تقویٰ اور دعوتی خدمات سے پورے ملک بلکہ عالمِ اسلام کو متاثر کیا۔ ڈاکٹر شعیب نگرامیؒ بھی اسی مبارک سرزمین کی ایک روشن یادگار تھے۔ ان کی شخصیت میں نگرام کی علمی روایت، تہذیبی وقار اور دینی حمیت صاف جھلکتی تھی۔

آپ سابق شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ حضرت مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے علمی اور دینی ماحول میں پرورش عطا فرمائی جہاں علم صرف کتابوں تک محدود نہیں تھا بلکہ زندگی کے ہر گوشے میں اس کی روشنی محسوس ہوتی تھی۔ اسی پاکیزہ ماحول نے ان کی شخصیت میں سنجیدگی، علم دوستی، دینی حمیت اور اکابر سے محبت پیدا کی۔

انہوں نے نگرام میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہوئے، ندوہ کی علمی فضا، اساتذۂ کرام کی تربیت اور وہاں کے دینی و ادبی ماحول نے ان کے ذوقِ علم کو مزید جلا بخشی۔ بعد ازاں جامعہ ازہر، قاہرہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور مختلف علوم وفنون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ مدینہ یونیورسٹی نے بھی ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں انہیں اعزازی ڈی۔لٹ عطا کیا، جو ان کے علمی مقام کا روشن اعتراف ہے۔

ڈاکٹر شعیب نگرامیؒ عربی زبان وادب کے ممتاز عالم اور صاحبِ قلم تھے۔ عربی زبان پر ان کی غیر معمولی گرفت تھی۔ انہوں نے عربی میں متعدد علمی، تحقیقی اور ادبی کتابیں تصنیف کیں جنہیں عرب دنیا میں بھی قدر واحترام کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان کی تحریروں میں تحقیق کی گہرائی، اسلوب کی خوبصورتی اور فکر کی پختگی نمایاں ہوتی تھی۔

آپ نے ایک طویل عرصہ لیبیا اور قاہرہ ریڈیو میں خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں دمام ریڈیو سے ان کا مقبول پروگرام ''یہ حدیث نہیں ہے'' نشر ہوتا رہا، جس کے ذریعے انہوں نے عوام میں صحیح دینی شعور بیدار کرنے کی قابلِ قدر کوشش کی۔ ان کا انداز نہایت شائستہ، مدلل اور عام فہم تھا۔ وہ سخت سے سخت مسئلے کو بھی نرمی اور حکمت کے ساتھ بیان کرتے تھے، اسی لیے لوگ ان کی گفتگو کو دل سے سنتے تھے۔

ڈاکٹر شعیب نگرامیؒ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کا غیر معمولی علمی ذوق تھا۔ وہ ہمیشہ علمی گفتگو فرماتے تھے۔ ان کی مجلس میں بیٹھنے والا کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں آتا تھا۔ گفتگو کا موضوع عموماً کسی نئی کتاب، کسی علمی تحریک، کسی فکری مسئلے یا اکابر علماء کی حیات وخدمات پر مشتمل ہوتا۔ ان کے حافظے کی وسعت، مطالعے کی گہرائی اور اندازِ گفتگو کی سنجیدگی سننے والوں کو متاثر کرتی تھی۔

کچھ عرصہ انہوں نے لکھنؤ میں بھی قیام فرمایا۔ اس دوران دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ صحافت میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔ طلبہ ان کے درس سے بے حد متاثر تھے، کیونکہ وہ صرف معلومات منتقل نہیں کرتے تھے بلکہ سوچنے کا سلیقہ عطا کرتے تھے۔ ان کے اندر نئی نسل کو علم سے جوڑنے کا سچا درد موجود تھا۔

مہمان خانہ ندوۃ العلماء میں جب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ سے ملاقات ہوتی...

(باقی صفحہ ۱۹/ پر)

حق وباطل

محرم الحرام- حقائق اور خرافات

مولانا عبدالسبحان ناخداندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

خواہشات جب دین کا لبادہ اوڑھتی ہیں تو بدعات وجود میں آتی ہیں۔ ان کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو بدعات کے پیچھے کچھ اس طرح کی نفسیات نظر آتی ہیں؛ اللہ کا دین ناکافی ہے، اللہ کا دین مشکل ہے، اللہ کا دین غیر ضروری ہے۔

پہلی شکل رہبانیت کو جنم دیتی ہے، دوسری صورت خواہش پرستی، سہولت پسندی اور بے عملی کی طرف لے جاتی ہے، اسی سے پھر انسان تیسرے اور آخری اسٹیج پر پہنچتا ہے۔

فی الوقت جو بدعات رائج ہیں، اس میں دوسری صورت زیادہ کارفرما نظر آتی ہے۔ چونکہ مکار ذہنیت دین کے نام پر بھی دین سے فرار چاہتی ہے، اس لیے دینداری کے بھرم کو باقی رکھنے کے دعوے پر پُرفریب بدعتیں وجود میں آتی ہیں، جس کے نتیجے میں پہلے بددینی اور آخر میں مکمل بے دینی آ ہی جاتی ہے۔ دین مکمل طور پر رسومات اور خرافات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ یہود میں استخفاف بالدین کا روگ تھا، جس کی وجہ سے دین اسی طرح خواہشات کی بھینٹ چڑھ گیا کہ دین کے نام پر خواہش پرستی، یا صحیح الفاظ میں مکمل نفس پرستی وجود میں آ گئی، جس کے بعد پھر انبیاء جھٹلائے جانے لگے اور قتل کیے جانے لگے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ دین کو نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔

﴿أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ﴾۔

(تو کیا ایسا نہیں ہوا کہ جب بھی تمہارے پاس رسول وہ پیغام لے کر آئے جو تمہاری نفسانی خواہش کے مطابق نہیں ہوتا تو تم تکبر کرنے لگتے؟ (اسی کا نتیجہ تھا کہ) ایک طبقہ کو جھوٹا قرار دیا اور ایک دوسرے طبقہ کو قتل بھی کرتے تھے۔)

یہود کی تمام بدعات وخرافات کا دروازہ اسی تصور سے کھلا کہ اللہ کا دین بہت مشکل ہے۔ نصاریٰ بالکل اس کے الٹے چلے، انہوں نے اللہ کے عطا کیے ہوئے دین کو ناکافی سمجھا، پھر غلط قسم کی رہبانیت کے ذریعے دین کے نام پر وہ تماشے کیے کہ نہ دین کے رہے اور نہ دنیا کے رہے۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کو ایک معمہ بنا دیا، پھر اسی عجوبے یا معمہ کو دین کی بنیاد قرار دے کر ہمیشہ کے لیے صحیح دین کو کھو دیا۔ عیسائیت کی گمراہی کے پیچھے یہی تصور ملے گا کہ اللہ کا دین ناکافی ہے۔ قرآنِ مجید اسی کو ''غلو فی الدین'' سے تعبیر کرتا ہے:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ﴾۔

(اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو، اللہ پر وہی بات کہو جو سچ ہے)۔

اور اسی سے ملتا جلتا معاملہ امتِ مسلمہ کے بعض طبقات کے ساتھ ہوا۔ بعض جانگداز واقعات کو بنیاد بنا کر اپنی پوری زندگی کو ان سے وابستہ کر دیا گیا، اس طرح گویا وہی اصل دین بن گیا۔ حد سے بڑھی ہوئی مظاہر پرستی نے رسومات اور خرافات کا دہانہ کھول دیا۔ جس دین کی سربلندی کے لیے اہلِ بیتِ رسول نے اپنے پورے گھرانے کو قربان کیا تھا، اسی واقعے کو حجاب بنا کر دین کے رخِ زیبا کو اوجھل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے ذریعے حق وصداقت اور ایثار و عزیمت کے جو سبق ملتے تھے، ان کو فراموش کر کے ان کی جگہ آہ و بکا، کم ہمتی اور بے چارگی کے سبق امت کو پڑھانے لگے۔ یہ تاریخی جرم مسلسل ہوتا رہا اور ان نفوسِ قدسیہ کی شہادت کا اصل پیغام نگاہوں سے اوجھل ہوتا رہا۔

حضرت حسینؓ کی شہادت کا جانگداز واقعہ اسلامی تاریخ کے دل کا کاری زخم ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا ہر وفادار سچا امتی اس کی چوٹ اپنے دل پر محسوس کرتا ہے، اور تاریخ کے ان مکار وعیار، محبت کا دم بھرنے والے دعویداروں کو معاف کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں جنہوں نے اپنے گھر بلا کر اس عظیم مہمان کو شہید کر ڈالا۔ اسی طرح وہ سفاک مجرم بھی کسی طور پر معافی کے قابل نہیں جنہوں نے خاندانِ نبوت کے ہنستے گھرانے کو اجاڑنے کی کوشش کی اور معصوم کلیوں تک کو مسل کر رکھ دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ بے غیرتی اور محسن کشی کی تاریخ میں اس سے بڑی اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ امت اس پر شرمسار ہے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست ہیں، لیکن کیا حضرت حسینؓ کی شہادت کا یہی مقصد تھا کہ لوگ رونے رلانے، تعزیہ داری اور ماتم شعاری کو اپنا اصل دین بنا کر اس دین کو مٹا ڈالیں جسے آباد و شاداب

رکھنے کے لیے اتنی بڑی قربانی دی گئی؟ یہ ان کی شہادت کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔

حق یہ ہے کہ حضرت حسینؓ سے دینی، روحانی اور جذباتی محبت رکھنے والے حق وصداقت کے علمبردار ہوتے ہیں، تعزیے کے علمبردار نہیں۔ جگر کا لہو دے کر گلشن اسلام کی آبیاری کرتے ہیں، آنسوؤں کا ڈھونگ رچا کر نہیں۔ حسینؓ سے سچی محبت رکھنے والے سنتِ رسول ﷺ کے اجالے بکھیرتے ہیں، خرافات کے اندھیرے نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو اپنا دین بہت عزیز ہے۔ اس کی مکمل پیروی کا حکم خود رسولِ اکرم ﷺ کو بھی تھا:

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔

(پھر ہم نے آپ کو اس دین کے خالص راستے پر مقرر کر دیا، آپ اسی کی پیروی کریں، ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو کچھ نہیں جانتے)۔

رسول اللہ ﷺ نے اس مقدس امانت کو من وعن اپنی امت تک پہنچایا، اسی لیے اپنا مقدس خون بہایا، راتوں کو اٹھ اٹھ کر آنسوؤں کے نذرانے پیش کیے، اس راہ میں بڑی سے بڑی جو قربانی ہوسکتی ہے وہ دی۔ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ ''اللہ کے راستے میں مجھے جتنا ستایا گیا کسی کو نہیں ستایا گیا''۔ پھر حضراتِ صحابۂ کرامؓ نے اس امانت کی حفاظت کی۔ حضراتِ خلفائے راشدین اس باب میں بھی سب سے ممتاز تھے۔ صدیقِ اکبرؓ ہوں یا فاروقِ اعظمؓ، عثمانِ غنیؓ ہوں یا علیِ مرتضیٰؓ، اصحابِ کرامؓ ہوں یا اہلِ بیتِ عظامؓ، ازواجِ مطہراتؓ ہوں یا بناتِ طیباتؓ، سب کا مشن یہی تھا کہ اس مبارک دین کی شمع فروزاں رہے، یہ چراغ کبھی بجھنے نہ پائے۔

اسی چراغ کو روشن کرنے کے لیے حضرت حسینؓ نے اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ اللہ کے حضور جان کی قربانی پیش فرمائی۔ پھر یہی مبارک دین تابعین، تبع تابعین، حضراتِ محدثین، مصلحین ومجاہدین کے ذریعے ہم تک پہنچا۔ اسی دین کو بعض نادان اور احمق بدعات وخرافات کے اندھیروں میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ نادان یہ نہیں جانتے کہ ان خرافات کے ذریعے اذیت پہنچ رہی ہے ان مبارک ومقدس ہستیوں کو جنہوں نے دین و شریعت، اسلام وایمان، حق وصداقت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ کیا ان بدعات وخرافات سے وہ بہت خوش ہوں گے؟ اللہ نے فہم کی سلامتی دی ہے، اس کی روشنی میں غور کیا جائے۔

☆☆☆

بقیہ: مولانا ڈاکٹر محمد شعیب نگرامی ندویؒ

تو مجلس فوراً علمی رنگ اختیار کر لیتی۔ کبھی کسی نئی کتاب پر گفتگو ہوتی، کبھی کسی قدیم علمی ذخیرے پر تبصرہ، اور کبھی اکابر امت کی شخصیات کے مختلف پہلوؤں پر بحث آتے۔

ڈاکٹر شعیب نگرامیؒ ان مجالس میں نہایت وقار، سنجیدگی اور علمی بصیرت کے ساتھ شریک ہوتے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اکابر کے فکر ومزاج سے کتنی گہری وابستگی رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ حضرت مولانا کا ذکر وہ ہمیشہ عقیدت، احترام اور والہانہ محبت کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں بارہا حضرت مولانا کی علمی بصیرت، دینی فکر اور اخلاقی عظمت کا تذکرہ آتا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا سعودی عرب تشریف لے گئے تو ڈاکٹر شعیب نگرامیؒ کے گھر بھی قیام فرمایا۔ یہ لمحہ ان کے لیے کسی عظیم سعادت سے کم نہ تھا۔ اسی سفر کی یاد میں انہوں نے ''تعمیر حیات'' میں ''آمدِ بہار'' کے عنوان سے ایک نہایت مؤثر اور محبت بھرا مضمون تحریر فرمایا، جس میں حضرت مولانا علی میاںؒ سے ان کی قلبی وابستگی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر شعیب نگرامیؒ کی زندگی نصف صدی سے زائد علمی، ادبی اور دینی خدمات سے عبارت ہے۔ انہوں نے خاموشی، وقار اور اخلاص کے ساتھ کام کیا۔ نہ شہرت کی خواہش کی اور نہ نمود و نمائش کو پسند کیا۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو خاموشی سے اپنا کام کرتے ہیں مگر اپنے پیچھے ایسی روشن یادیں چھوڑ جاتے ہیں جو مدتوں باقی رہتی ہیں۔

راقم کے لیے ان کی رحلت کا غم اس لیے بھی بہت گہرا اور ذاتی ہے کہ ہمارا تعلق صرف ایک رسمی خاندانی نسبت تک محدود نہیں تھا۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح چاہا، شفقت فرمائی اور ہر موقع پر حوصلہ افزائی سے نوازا۔ محبت بھرے انداز میں وہ مجھے ''فخر خاندان'' اور ''فیضانِ نگرام'' کہا کرتے تھے۔ ان کے یہ محبت بھرے الفاظ آج بھی دل میں گونجتے ہیں اور آنکھوں کو نم کر دیتے ہیں۔

آج وہ بظاہر ہمارے درمیان موجود نہیں، مگر ان کی یادیں، ان کی تحریریں، ان کی دعائیں اور ان کی محبتیں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

☆☆☆

دین کامل

انسانی اور اخلاقی اقدار کا بحران

مولانا محمد وثیق ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اس وقت انسانی دنیا جس اخلاقی انارکی، تہذیبی زوال اور اخلاق سوز برائیوں سے دوچار ہے، شاید انسانی تاریخ نے اس سے زیادہ ہولناک صورتحال کبھی نہ دیکھی ہو، آج کی نام نہاد مہذب دنیا، جو سائنس، ٹیکنالوجی اور مادی ترقی کے نشے میں سرشار ہے، درحقیقت روحانی افلاس، اخلاقی دیوالیہ پن اور انسانی اقدار کی تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ حال ہی میں منظر عام پر آنے والی ''جیفری اپسٹین فائلز'' نے مغربی تہذیب کے اس تاریک، بھیانک اور گھناؤنے چہرے کو بے نقاب کر دیا ہے، جو آزادی، انسانی حقوق، عورتوں کے احترام اور بچوں کے تحفظ جیسے خوش نما نعروں کے پیچھے صدیوں سے چھپا ہوا تھا، یہ محض چند افراد کے اخلاقی جرائم کا معاملہ نہیں، بلکہ ایک ایسی تہذیب کا المیہ ہے جس نے خدا سے اپنا رشتہ توڑ کر نفسانی خواہشات، زر و زن پرستی، جنسی آزادی اور مادی لذت کو زندگی کا مقصد بنا لیا ہے، چنانچہ آج انسان ظاہری اعتبار سے ترقی یافتہ، مگر باطن کے لحاظ سے کھوکھلا، بے روح اور حیوانی خواہشات کا غلام بن چکا ہے۔

''جیفری اپسٹین فائلز'' نے جو گھناؤنے جرائم بے نقاب کیے ہیں، وہ ایسی حیوانی و شیطانی رسوائیاں ہیں جو انسان کو نفرت، کراہت اور قے کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں؛ معصوم بچوں کی عصمت دری، زندہ انسانوں کے اعضاء کاٹنا، کم سن لڑکیوں کی بے حرمتی، ان کے جسموں کے بے دردی سے ٹکڑے اور انسانیت سوز مظالم کی وہ داستانیں ہیں جن سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

''اپسٹین فائلز'' نے اس حقیقت کو آشکار کر دیا کہ مغرب کے سیاسی قائدین، اقتصادی ماہرین، دانشور اور معاشی اشرافیہ دراصل اخلاقی پستی کے ایسے گڑھے میں گر چکے ہیں جہاں انسانیت، شرافت، حیا اور رحم کا کوئی تصور باقی نہیں رہا، جنسی بلیک میلنگ، سیاسی شخصیات کو شہوت اور دولت کے جال میں پھانس کر ان سے مقاصد حاصل کرنا، یہ سب اس ''مغربی تہذیب'' کی اصل تصویر ہے جو دنیا کو انسانیت کا سبق پڑھانے، عورتوں اور بچوں کے حقوق کے تحفظ کا دعویٰ کرتی ہے۔ مغربی تہذیب نے انسان کو عزتِ نفس سے محروم کر کے محض ایک ''استعمال کی چیز'' بنا دیا ہے، عورت آزادی کے نام پر بازار کی زینت بن گئی، انسان کی عظمت و شرافت خواہشات کی نذر ہو گئی اور اخلاقی حدود کو ''قدامت پسندی'' قرار دے کر پامال کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج ''رذائل و فحاشی'' کو ''محاسن و خوبی''، ''بے حیائی'' کو ''روشن خیالی'' اور ''فطرت سے بغاوت'' کو ''انسانی آزادی'' کہا جا رہا ہے۔

اپسٹین فائلز نے (پسِ پردہ حقائق اس سے کہیں زیادہ ہولناک ہیں) مغربی تہذیب کے اس تاریک، مکروہ اور کریہہ چہرہ کو بے نقاب کر دیا ہے جس کے قائدین اور علم بردار اپنی درندگی، بے حیائی اور اخلاقی پستی میں ان تمام حدود کو پار کر چکے ہیں جن تک انسان کبھی پہنچا تھا۔ یہی تہذیب آج خود کو ''مہذب دنیا'' کی قائد اور انسانیت کی رہنما قرار دیتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ انسان کو تہذیب و شرافت کی بلندیوں کی طرف نہیں، بلکہ اخلاقی گراوٹ، جنسی بے راہ روی، عیاشی، معاشی استحصال، ظلم، دہشت اور تباہی کے جہنم کی طرف دھکیل رہی ہے۔

دنیا پر غلبہ حاصل کرنے والی طاقت ''صہیونیت'' نے بہت پہلے یہ حقیقت سمجھ لی تھی کہ قوموں کو صرف فوجی طاقت سے غلام نہیں بنایا جا سکتا، بلکہ ان کے اخلاق کو تباہ کر کے، ان کے خاندانی نظام کو کمزور کر کے اور ان کے ایمان و اقدار کو ختم کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے بے بس بنایا جا سکتا ہے، چنانچہ ''صہیونی دانشوروں کے پروٹوکول'' کے مطابق فحاشی، عریانیت، سود، شراب، بے راہ روی اور اخلاقی بے حسی کو عالمی ثقافت کے نام پر عام کیا گیا، میڈیا، فلم، فیشن اور تفریح کے ذرائع کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا کہ انسان اپنی مذہبی اور اخلاقی شناخت کھو بیٹھے اور صرف خواہشات کا اسیر بن جائے، اپسٹین جزیرہ میں مغربی اشرافیہ کے جو گھناؤنے جرائم منظر عام آ رہے ہیں، وہ صہیونی دانشوروں کے دستاویزات میں پیش کیے گئے منصوبہ کی عملی تصویر ہے، اور خود اس جزیرہ کا مالک جیفری اپسٹین صہیونیوں کا پروردہ بلکہ یہودی ہے، اپسٹین فائلز نے جو انکشافات کیے ہیں، وہ ''عہد قدیم'' اور ''تلمود'' کی تعلیمات کا پورا مظہر ہیں، صہیونی پروٹوکول میں قوموں کو غلام بنانے اور

پوری دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، وہی اس وقت دنیا میں رائج ہے اور دنیا کی قوتیں صہیونی خاکہ میں کسی نہ کسی طریقہ سے رنگ بھر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے بیشتر معاشرے خاندانی انتشار، ذہنی اضطراب، خودکشی، جرائم، منشیات اور جنسی بے راہ روی کے طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔ دین واخلاق کو اباحیت والحاد اور خالص مادی نظریات ومذاہب کے ذریعہ پامال کیا جارہا ہے، اور جو بھی ''تسخیرِ عالم کے صہیونی منصوبہ'' کی تکمیل میں رکاوٹ بنتا یا بن سکتا ہے، اس کو جنس اور مال کے جال میں پھنسا کر ختم کردیا جاتا ہے۔

''عالمی صہیونیت'' کا ایک نہایت خطرناک منصوبہ یہ ہے کہ پوری دنیا پر اپنا تسلط قائم کیا جائے، تاکہ نسلِ داؤد سے تعلق رکھنے والا ایک حکمراں دنیا کی قیادت سنبھالے، بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ بحال کرے اور تمام قوموں کو ''یہودی تسلط'' کے تابع بنادے۔ صہیونی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جب تک دنیا میں دین، اخلاق اور اعلی انسانی اقدار باقی رہیں گی، اس وقت تک انسانی دنیا کو مکمل طور پر غلام نہیں بنایا جاسکتا، اس لیے صہیونیت کی بنیادی کوشش یہ رہی ہے کہ لوگوں کے دلوں سے ایمان و اخلاق کو نکال دیا جائے اور انسانی معاشروں کو فکری و اخلاقی انارکی کا شکار کردیا جائے، اسی مقصد کے تحت۔ جیسا کہ ''**حقيقة اليهود**'' کے مصنف فواد بن سید عبدالرحمن رفاعی نے محمد خلیفہ تونسی کی کتاب ''**الخطر اليهودي**'' یا ''**بروتوكولات حكماء صهيون**'' کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ وہ درج ذیل مقاصد کے حصول کی کوشش کرتے رہے ہیں:

''۱۔ شراب، سود، زنا، جھوٹ، دھوکہ، خیانت، بے حیائی اور دوسری اخلاق سوز برائیوں کے ذریعہ قوموں کے اخلاق کو تباہ کرنا، تاکہ انسان اپنی دینی طاقت اور اخلاقی پاکیزگی سے محروم ہوجائے۔

۲۔ خفیہ انجمنوں، سیاسی و مذہبی اداروں، کھیل کود کی تنظیموں، فری میسن لاج اور روٹری کلبوں کے ذریعہ دنیا بھر میں فتنہ، اختلاف، انتشار، فکری انحراف اور تہذیبی ٹکراؤ کو فروغ دینا اور ایک ہی قوم کے اندر متضاد نظریات پیدا کرنا؛ جبکہ خود یہودی قوم کو اس تباہ کن ماحول سے محفوظ اور منظم رکھنا۔

۳۔ حکومتوں اور عوام کے درمیان دائمی کشمکش پیدا کرنا؛ حکومتوں کو ظلم و جبر پر ابھارنا اور عوام کو بغاوت پر آمادہ کرنا، تاکہ دونوں ہمیشہ باہم دست وگریباں رہیں۔

۴۔ حکمرانوں، وزیروں اور بااثر شخصیات کو زن، زر، شراب، جوا، رشوت، اقتدار اور سازشوں کے ذریعہ اخلاقی پستی اور عیاشی میں مبتلا کرنا، تاکہ وہ اپنے اصولوں، ذمہ داریوں اور قومی مفادات سے غافل ہوجائیں''

(بحوالہ: حقیقۃ الیہود، ص: ۱۲-۱۳)

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسامہ عدوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ انویسٹمین فائلز نے ''عالمی بلیک میلنگ کے اس جال کو بے نقاب کردیا ہے جس نے مغربی اشرافیہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا؛ وہ اشرافیہ جو مدتوں آزادی، انسانی وقار اور تہذیبی برتری کے دعوے کرتی رہی، مگر حقیقت میں اپنی خواہشات کی غلام اور اخلاقی رسوائی کی اسیر نکلی''۔

کینیڈا کے وزیر اعظم نے مغربی اشرافیہ کے ایک اہم عالمی فورم میں اعتراف کیا کہ:

''اب اس جھوٹ اور پرفریب نظام میں مزید زندگی گزاری نہیں جاسکتی اور سوویت یونین کے سقوط کے بعد امریکہ کی قیادت میں قائم عالمی نظام عملاً ختم ہوچکا ہے''۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کے نام نہاد ''مہذب'' اور ''روشن خیال'' خود انسانی زندگی کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو سائنس، ٹیکنالوجی، سرمایہ، اقتدار اور عالمی اداروں پر قابض ہیں، اور زمین میں فساد برپا کررہے ہیں، انسانیت کو اخلاقی تباہی کی طرف دھکیل رہے ہیں، اور بے حیائی، ظلم، استحصال اور فکری انتشار کے نئے نئے ذرائع ایجاد کررہے ہیں۔

دنیا کے موجودہ حالات کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی مشکلات، اضطراب اور انتشار کی بڑی وجہ انہی نام نہاد مہذب قوتوں کی غلط قیادت اور غیر ذمہ دارانہ طرز عمل ہے۔ انسان روز بروز بے چینی، ڈر، خوف، کرب، دہشت اور پریشانی کا شکار ہوتا جارہا ہے، جبکہ وہ عالمی ادارے اور تنظیمیں جو انسانیت کی خدمت، فلاح وبہبود اور قیامِ امن کے لیے وجود میں آئی تھیں، خود بڑی قوتوں کے ہاتھوں کھلونا بن چکی ہیں، وہ آزادانہ فیصلے کرنے سے عاجز ہیں، کیونکہ ان پر طاقتور اور خودغرض قوتوں کا تسلط ہے۔

یہ دنیا آج ایک عجیب اخلاقی انارکی وتاریکی میں ڈوب چکی ہے، ضمیر مرچکا ہے، احساسات مفلوج ہوچکے ہیں، حیا رخصت ہوچکی ہے اور انسانی اقدار اور شرافت پامال ہوچکی ہے، گویا مغربی تہذیب نے انسان سے اس کا دل، اس کی بصیرت اور اس کی روح چھین لی ہے، وہ شکل و

صورت، لباس اور رہن سہن میں انسان دکھائی دیتا ہے، مگر اپنی خواہشات، اپنی جبلتوں اور اپنے رجحانات میں ایک درندہ بن چکا ہے۔

مغرب نے اگرچہ سائنسی اور صنعتی میدانوں میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی، مگر وہ انسان کے باطن کو سنوارنے میں ناکام رہا، اس نے مشینیں تو بنا لیں، مگر انسانیت کھودی؛ ایٹم کو مسخر کرلیا، مگر نفس کو قابو نہ کرسکا؛ چاند تک پہنچ گیا، مگر اپنے دل کے اندھیروں کو دور نہ کرسکا۔

مغربی تہذیب اپنی روحانی و اخلاقی قدروں، انسانی خصائص اور معاشرتی بنیادوں کو پامال کرکے گویا اپنے افلاس و دیوالیہ پن کا خود اعلان کر رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب نے تہذیب وتمدن کا جو تصور دیا ہے اس کی بنیاد مادیت اور لادینیت ہے، جس میں روحانی واخلاقی قدروں کو یکسر فراموش کردیا گیا ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو؟ جو قوم ''فیضان سماوی'' سے محروم ہو اس کے کمالات کی حد برق وبخارات تک ہی محدود رہتی ہے:

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق وبخارات

اس تہذیب کے ابتدائی خدوخال کو دیکھ کر ہی شاعر مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے یہ پیشین گوئی کردی تھی کہ:

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

آج یہ پیشین گوئی حرف بحرف سچ ثابت ہورہی ہے، کہ مذہب بیزار اور ملحدانہ مادی تہذیب وتمدن نے مغرب بلکہ پوری دنیائے انسانیت کو بربادی اور بربریت کے مہیب غار میں دھکیل دیا ہے۔ڈاکٹر الکسس کیرل (Alexis Carrel) نے لکھا ہے:

''تہذیب جدید (مغربی تہذیب وتمدن) نے انسانوں کو مذہبی اصولوں اور پاکی کی عائد کردہ تنظیمات سے آزاد کردیا ہے، اور یہ انہیں ہر ممکنہ طریقہ سے حصول زر کی ترغیب دیتی ہے، موجودہ طرز زندگی، انسانوں کو اکثر وبیشتر جنسی خواہشات میں مبتلا کرتی ہے اور جنسی بھوک کی آسان تسکین فراہم کرتی ہے، یہ مسلسل کوشش، تنظیم، جدوجہد اور ہر اس چیز سے نجات دلاتی ہے جس میں مشکلات اور محنت ہو''۔

آج دنیا کو ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو انسانی تہذیب کی مادی ترقی کو برقرار بھی رکھ سکے اور اسے مزید فروغ بھی دے، لیکن ساتھ ہی ایسی کامل اور ہمہ گیر قدروں کے ساتھ جو انسانی تاریخ کے معروف تصورات سے کہیں بلند ہوں اور ایسے سچے، مثبت اور حقیقت پسندانہ طریقہ کے ساتھ جو روح اور مادہ، عقل اور قلب، فرد اور جماعت کے درمیان توازن قائم کرسکے، اور یہ حقیقت ہے کہ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس کے پاس یہ قدریں بھی ہیں اور یہ متوازن وجامع نظام بھی۔

سائنسی نشاۃ ثانیہ نے اپنا تاریخی کردار ادا کرلیا؛ وہ تحریک جس کی ابتدائی کرنیں سولہویں صدی عیسوی کے دورِ نشأت ثانیہ میں ظاہر ہوئیں اور جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اپنے عروج کو پہنچی، اب اپنے اندر کوئی نیا سرمایہ اور تازہ روح باقی نہیں رکھتی۔

اسی طرح ''وطنیت''، ''قومیت'' اور مختلف علاقائی اتحادوں نے بھی گزشتہ صدیوں میں اپنا کردار ادا کیا، لیکن اب وہ بھی انسانیت کو کوئی نیا پیغام، نئی بصیرت یا نئی امید دینے سے قاصر ہیں۔

بالآخر استبدادی نظام بھی ناکام ہوئے اور جمہوری نظام بھی، اب اسلام اور امتِ مسلمہ کا دور اس وقت آیا ہے جب دنیا شدید اضطراب، حیرت، فکری انتشار اور اخلاقی بحران سے دوچار ہے۔

یہ اسلام ہی ہے جو مادی ترقی اور زمینی ایجادات کا منکر نہیں، بلکہ انہیں انسان کی اس بنیادی ذمہ داری کا حصہ قرار دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں خلافت عطا کرتے وقت سونپی تھی اور مخصوص شرائط کے ساتھ انہیں خدا کی بندگی اور مقصدِ زندگی کی تکمیل کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

اسلام ہی وہ واحد نظامِ زندگی ہے جو اپنی جامعیت، اعتدال اور توازن کے باعث روحانی، اخلاقی اور مادی زندگی کے تمام مسائل کا صحیح اور موثر حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ ان عصری بحرانوں کا مداوا کرسکتا ہے جو مذہب، اخلاق اور انسانی قدروں سے عاری مغربی تہذیب کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔اسلام انسان کو ان مصائب وآلام اور روحانی خلا سے نجات دلا سکتا ہے جن کا وہ آج شکار ہے، اور یہ کام وہ اس طرح انجام دیتا ہے کہ انسان کی حاصل کردہ سائنسی و تکنیکی ترقی سے دست بردار ہونے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی؛ بلکہ اسلام ان مادی وتکنیکی کامیابیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اپنی اخلاقی وروحانی قدروں کے تابع بناتا ہے، اور انہیں ایسی متوازن سمت عطا کرتا ہے جو تہذیب کے دوام، انسان کے اندرونی سکون، معاشرتی سلامتی اور کائناتی ہم آہنگی کی ضامن ہو۔

لہٰذا اسلام ہی حقیقی متبادل ہے، اسلام ہی انسانیت کے مسائل کا حل ہے، اور وہی ایسا ابدی و ہمہ گیر دین ہے جو بقا، حقیقی سعادت اور صالح و عادل قیادت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

☆☆☆

علم ربانی

علمِ نافع کا قرآنی تصور

مولانا محمد نصر اللہ ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

اسلام نے علم کو غیر معمولی عظمت اور رفعت عطا کی ہے۔ قرآنِ کریم کی پہلی وحی ہی "اِقْرَأْ" (پڑھیے) کے حکم سے شروع ہوئی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی بنیاد علم، شعور اور معرفت پر قائم ہے۔ تاہم اسلام میں علم کا مقصد صرف معلومات کا ذخیرہ جمع کرنا، ڈگریاں حاصل کرنا یا دنیاوی ترقی کی منازل طے کرنا نہیں، بلکہ انسان کو اپنے رب کی معرفت، اصلاحِ نفس، خدمتِ خلق اور آخرت کی کامیابی تک پہنچانا ہے۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر حصولِ علم کے ان بلند مقاصد کو بیان کیا ہے، جن میں سے چند اہم مقاصد درج ذیل ہیں:

۱- اللہ کے نام سے آغاز ہو:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ (العلق: ۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تعلیم کا آغاز رب کے نام سے ہونا چاہیے، تاکہ علم حاصل کرنے میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد شامل رہے اور علم میں اضافہ اور برکت نصیب ہو۔ ایک طالبِ علم کے لیے پہلا سبق یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی پڑھے، اللہ کے نام سے پڑھے اور ہر وقت اللہ کو یاد رکھے۔

۲- معرفتِ الٰہی کا حصول

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے یہ جانے کہ اس دنیا کو اور اس میں بسنے والے انسانوں کو کس نے پیدا کیا، اس کا خالق و مالک کون ہے، اس کا پروردگار اور پالنہار کون ہے۔ یعنی علم کا دوسرا مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان ہے۔ علم کا مقصد شہرت، عزت، دولت اور منصب کا حصول نہیں ہے۔ اگر کوئی ان مقاصد کے لیے تعلیم حاصل کرتا ہے تو اس کا انجام گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (فاطر: ۲۸)

یعنی اللہ کے بندوں میں سے صرف اہلِ علم ہی اس سے حقیقی خشیت رکھتے ہیں۔

انسان جب اپنے رب کو پہچان لیتا ہے تو اس سے ڈرتا بھی ہے؛ اس لیے کہ علم انسان کے شعور کو بیدار کرتا ہے، عقل کو جلا بخشتا ہے اور روح کو غذا فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ (الزمر: ۹)

یعنی اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو صرف عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں۔

۳- علم کا مقصد عمل ہے

علم کا مقصد اس پر عمل کرنا، اپنے کردار و اخلاق کی اصلاح کرنا اور زندگی کے رخ کو درست کرنا ہے۔ یہ محض رسمی ڈگری حاصل کرنے کا نام نہیں بلکہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ انسان ایسی بات کہے جس پر خود عمل نہ کرتا ہو:

﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾

اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے لیے عملِ صالح کو شرط قرار دیا ہے۔ علم کے نور سے اپنی زندگی اور پورے معاشرے بلکہ پوری انسانیت کو روشنی عطا کرنا ہی علم کا اصل مقصد ہے۔ علم صرف الفاظ کی بازی گری کا نام نہیں بلکہ کردار کی حقیقت کا نام ہے۔

۴- علم کا مقصد ہدایت اور نور ہے

علم انسان کو تاریکی سے نکال کر ہدایت کے نور سے منور کرتا ہے۔ وہ انسان کو گمراہی سے بچاتا ہے اور حق کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔ علم ایک ایسی روشنی ہے جس سے کفر و شرک کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿الر كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ (ابراھیم: ۱)

علم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ (البقرۃ: ۲۵۷)

یعنی اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔

۵- علم کا مقصد عقل کا صحیح استعمال ہے

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر غور و فکر کی دعوت دی ہے اور عقل کے استعمال پر ابھارا ہے، تاکہ ذہن و دماغ کے دریچے وا ہوں، فکر و نظر کے گوشے کھل جائیں اور انسان اندھی تقلید سے محفوظ رہے۔

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (آل عمران: ۱۹۰)

یعنی آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات دن کے بدلنے میں عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

۶۔ علم کا مقصد دوسروں کو گمراہی سے بچانا ہے:

علم کا اصل مقصد صرف معلومات حاصل کرنا نہیں، بلکہ لوگوں کو گمراہی سے نکال کر راہِ ہدایت دکھانا ہے۔ قرآنِ مجید بار بار اہلِ علم کو یہ ذمہ داری دیتا ہے کہ وہ حق کو واضح کریں اور باطل کو بے نقاب کریں۔ جو شخص علم کو دوسروں کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے استعمال کرتا ہے، وہی حقیقی معنی میں علم کا حق ادا کرتا ہے۔ اسی لیے علماء کو امت کا رہبر کہا گیا ہے کہ وہ اپنے علم کے ذریعے معاشرے کو فتنہ وضلالت سے بچاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ (التوبۃ: ۱۲۲)

اور اہلِ ایمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ پھر کیوں نہ ہر جماعت میں سے ایک گروہ نکلے تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرے اور واپس آ کر اپنی قوم کو خبردار کرے، تاکہ وہ بھی نافرمانی سے بچیں۔

قرآنِ مجید میں انبیائے کرام علیہم السلام کی ذمہ داری یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ معلوم ہوا کہ علم حاصل کرنے کے بعد اگلا کام اسے دوسروں تک پہنچانا ہے۔

۷۔ علم کا مقصد علمِ نافع کا حصول ہے

قرآن وسنت کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر علم یکساں نہیں ہوتا، بلکہ اصل مطلوب علمِ نافع ہے۔ رسول اللہ ﷺ جو علم لے کر آئے، وہی انسان کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش علم ہے۔ اسی علم کے ذریعے انسان شیطان کے مکر و فریب سے محفوظ رہتا ہے اور دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (العلق: ۵)

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

انسان کو جو علم ملا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ امانت ہے، لہٰذا اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس علم کو محفوظ رکھے اور آنے والی نسلوں تک منتقل کرے۔

۸- علم کا مقصد حکمت و دانش مندی سے آراستہ ہونا ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (النحل: ۱۲۵)

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیجیے۔

اگر بحث و مباحثہ کی ضرورت پیش آئے تو خوش اسلوبی اور حسنِ اخلاق کے ساتھ کیا جائے:

﴿وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

یعنی ان سے بہترین طریقے سے گفتگو اور بحث کیجیے۔

۹۔ غیر مسلم اور نافرمان کو بھی نرمی اور حکمت کے ساتھ دعوت دینا

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے فرمایا:

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ﴾

یعنی تم دونوں اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرلے یا ڈر جائے۔

علم کا حقیقی مقصد صرف معلومات جمع کرنا نہیں، بلکہ انسان کو ایسا بنانا ہے جو دوسروں تک حق بات نرمی، حکمت اور حسنِ اخلاق کے ساتھ پہنچائے۔

حقیقی علم وہی ہے جو انسان کے اخلاق میں نرمی، گفتگو میں شائستگی اور دعوت میں حکمت پیدا کرے، اور یہی انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔

۱۰۔ علم کا مقصد جذبۂ شکر پیدا کرنا ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ﴾ (المائدۃ: ۱۱۰)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا تذکرہ فرما کر شکر گزاری کی طرف توجہ دلائی ہے۔ علم بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، اس لیے علم کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کا شکر گزار بنے۔

۱۱۔ علم کا مقصد آخرت کی کامیابی ہے

اصل علم وہ ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے جوڑے، عملِ صالح کی راہ دکھائے اور آخرت کی کامیابی سے ہم کنار کرے۔ قرآنِ کریم کی نظر میں دنیا کی زندگی عارضی اور فانی ہے:

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾

کامیابی کا اصل معیار آخرت کی کامیابی ہے، یعنی جنت کا حصول اور جہنم سے نجات۔

آخری بات

علم چونکہ ایک عظیم نعمت اور بہت بڑی دولت ہے، اسی پر دنیا و آخرت کی کامیابی کا دار و مدار ہے، اس لیے ہمیشہ اس میں اضافے کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔

﴿وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۴)

''اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔''

☆☆☆

فقہ اسلامی

طلاق کا اختیار مرد کو کیوں؟

مولانا منور سلطان ندوی (رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

طلاق ایک انسانی ضرورت ہے۔ اس حقیقت کو دنیا تسلیم کر چکی ہے، اسی لیے جہاں تمام ادیان میں طلاق کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے لیے واضح خطوط متعین کیے گئے ہیں، وہیں معاصر قوانین میں بھی طلاق کا نظام رکھا گیا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اب طلاق کی ضرورت پر گفتگو کی ضرورت باقی نہیں رہی، البتہ یہ سوال اب بھی بحث طلب ہے کہ طلاق کا اختیار کس کو ملنا چاہیے؟

تین امکانات:

عقلی طور پر نکاح کے خاتمے کے بنیادی اختیار کے بارے میں صرف تین امکانات پائے جاتے ہیں۔ پہلا امکان یہ ہے کہ طلاق کا اختیار صرف مرد کو حاصل ہو، دوسرا امکان یہ ہے کہ طلاق کا اختیار صرف عورت کو حاصل ہو، اور تیسرا امکان یہ ہے کہ مرد و عورت کے بجائے عدالت یا سماج کو یہ اختیار دیا جائے۔

اسلامی نقطۂ نظر:

اسلام کے عائلی نظام میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ خاندان کی سربراہی اور معاشی ذمہ داری مرد پر رکھی گئی ہے۔ نکاح کے نتیجے میں عورت کے نفقہ، مہر، رہائش اور دیگر مالی ذمہ داریاں مرد سے متعلق ہیں۔ اس ذمہ داری کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ اس رشتے کو ختم کرنے کی اگر کبھی ضرورت پیش آئے تو اس کا اختیار مرد کو ہی ملنا چاہیے، تبھی ذمہ داری اور اختیار میں تناسب ممکن ہو سکتا ہے۔

﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ (سورۂ نساء: ۳۴)

اس آیت میں دو علتیں بیان کی گئی ہیں: اول بعض اوصاف و صلاحیت میں فرق، اور دوم مالی ذمہ داری۔

امام رازی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: جان لینا چاہیے کہ مرد کی عورت پر فضیلت ایک معلوم اور مسلم امر ہے۔ البتہ یہاں اس فضیلت کے ذکر میں دو احتمالات ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ مرد کئی امور میں عورتوں پر زائد فضیلت رکھتا ہے۔ ان امور میں سے ایک عقل ہے، دوسرا دیت کا مسئلہ، تیسرا میراث کا مسئلہ، چوتھا امامت، قضا اور شہادت کی اہلیت، پانچواں یہ کہ مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرے یا باندی رکھے، جبکہ عورت کو شوہر کی موجودگی میں ایسا کوئی حق حاصل نہیں۔ چھٹا یہ کہ بعض صورتوں میں شوہر کو بیوی کی میراث میں اتنا حصہ ملتا ہے جو بیوی کے شوہر کی میراث میں ملنے والے حصے سے زیادہ ہوتا ہے۔ ساتواں یہ کہ شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے کا اختیار رکھتا ہے، اور جب وہ طلاق دے دے تو رجعی طلاق کی صورت میں اس کو رجوع کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے، خواہ عورت اس پر راضی ہو یا نہ ہو، جبکہ عورت کو شوہر کو طلاق دینے کا اختیار حاصل نہیں۔ آٹھواں یہ کہ مالِ غنیمت میں مرد کا حصہ عورت کے حصے سے زیادہ ہوتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس آیت کا مقصد یہ بیان کرنا ہو کہ ازدواجی زندگی سے حاصل ہونے والے منافع، راحتیں اور لذتیں دونوں فریقوں کے درمیان مشترک ہیں؛ کیونکہ نکاح کا اصل مقصد سکون، باہمی انس و محبت، نسلوں کا باہم مربوط ہونا، اعوان و احباب کی کثرت اور جائز لذت کا حصول ہے، اور یہ تمام فوائد مرد و عورت دونوں کو حاصل ہوتے ہیں۔

فیصلہ سازی اور جذباتیت:

دوسرا اہم اور قابلِ توجہ پہلو جذبات اور فیصلہ سازی کا ہے۔ ماہرینِ نفسیات کسی نہ کسی درجے میں ضرور قبول کرتے ہیں کہ عموماً عورتیں جذبات کے اظہار، ہمدردی اور حساسیت میں مردوں سے آگے ہوتی ہیں۔ جدید نفسیات کے متعدد محققین مثلاً سائمن بیرن کوہن، این کیمبل اور ڈینیل گولمین کے مطابق خواتین اوسطاً جذبات کے اظہار، ہمدردی اور دوسروں کے احساسات کے ادراک میں مردوں سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ یہ فرق عمومی رجحان (General Tendency) کے درجے میں ہے، نہ کہ ایسا مطلق اصول جو ہر فرد پر یکساں طور پر صادق آتا ہو۔

فیصلہ سازی میں جذبات کا بڑا دخل ہوتا ہے، اور جب معاملہ کسی گھر کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا ہو تو ایسے موقع پر فیصلہ میں سمجھ داری ضروری ہے، کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی میں ایک آباد خاندان ویران ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ میں دینے میں زیادہ مصلحت ہے۔

اگر صرف مرد کو طلاق کا اختیار ہوتا اور علیحدگی کے حوالے سے عورت کے پاس کوئی اختیار نہ ہوتا، تب بھی اس نظام پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، لیکن شریعتِ اسلامیہ کا کمال یہ ہے کہ اس نے مرد کو طلاق کا اختیار دینے کے باوجود عورت کو بے بس نہیں چھوڑا، بلکہ خلع، تفویضِ طلاق اور فسخ کی شکل میں اس کے لیے ایسے قانونی اور شرعی راستے مقرر کیے جن کے ذریعے وہ ناقابلِ برداشت ازدواجی زندگی سے نجات حاصل کرسکتی ہے۔

اگر عورت بھی معاشی اعتبار سے خود مختار ہو جائے تو کیا طلاق کے اختیار میں تبدیلی ہونی چاہیے؟

موجودہ وقت میں معاشی سرگرمیاں صرف مرد کی حد تک محدود نہیں ہیں، بلکہ عورتوں میں بھی ملازمت اور کاروبار کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب مرد کو طلاق کا اختیار دیے جانے کی علت عورت کی ذمہ داری اٹھانا ہے تو اس علت کے بدلنے سے حکم پر کوئی اثر پڑے گا؟

اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے عورت کے نفقہ، رہائش اور دیگر اخراجات کی ذمہ داری مرد کی ہے اور وہی مسئول ہے۔ اگر عورت کماتی ہے یا کاروبار کرتی ہے تو وہ اس کی اپنی ملکیت ہوگی۔ عورت اپنے مال سے گھر چلانے کی پابند نہیں ہے، اس طرح صاف نظر آتا ہے کہ فقہی نقطۂ نظر سے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اس مسئلہ میں معاصر اہم علم کے دو رجحانات ہیں، پہلا رجحان تو یہی ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ حق طلاق صرف معاشی ذمہ داری سے متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ مسئلہ پورے خاندانی نظام اور خصوصاً قوامیت سے متعلق ہے، مرد پر گھر چلانا واجب ہے، جبکہ عورت کا معاشی سرگرمیاں انجام دینا اتفاقی امر ہے۔

اس کے برعکس بعض مفکرین اور قانون دانوں کا رجحان یہ ہے کہ عورتوں کی بڑھتی ہوئی معاشی سرگرمیوں اور سماج کے بدلتے ہوئے حالات میں تفویض طلاق، خلع اور فسخ نکاح کے دائرہ کے وسیع کرنے اور عورت کے قانونی تحفظات پر غور کیا جانا چاہئے، ان حضرات کے نزدیک قوامیت کی علت مالی کفالت ہے، لہذا جب عورت خود کمانے لگے تو عورت کے اختیارات پر نظرثانی ہونی چاہیے، اس رجحان کے اثرات مسلم ممالک کے عائلی قوانین میں نظر آتے ہیں۔

کیا عورت کو طلاق کا اختیار ملنا چاہیے؟

جمہور علماء کے نزدیک طلاق کا اصل حق مرد کو دیا گیا ہے، البتہ شریعت نے عورت کو بھی خلع، تفویضِ طلاق اور فسخ کی صورت میں علیحدگی کے متعدد راستے فراہم کیے ہیں۔ اس طرح عورت کو ازدواجی تعلق کے خاتمے سے متعلق قانونی اور شرعی ذرائع مہیا ہیں۔

اس کے برعکس بعض معاصر مفکرین اور قانون دان یہ رائے رکھتے ہیں کہ سماجی تبدیلیوں کے نتیجے میں عورت کو تفویضِ طلاق، خلع اور فسخ کے سلسلے میں مزید مؤثر اختیارات ملنے چاہییں تاکہ ازدواجی زندگی کے ناقابلِ برداشت ہونے کی صورت میں عورت مؤثر قانونی راستہ اختیار کرسکے۔

اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر بعض مساوات پسند مفکرین، جن میں آمنہ ودود اور ان کے ہم خیال مصنفین نمایاں ہیں، یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ جس طرح مرد کو یک طرفہ حقِ طلاق حاصل ہے، اسی طرح عورت کو بھی مساوی طور پر یہ حق حاصل ہونا چاہیے۔ تاہم یہ رائے معاصر مسلم فکر میں ایک محدود حلقے تک پائی جاتی ہے اور اسے جمہور علماء یا اکثر اصلاح پسند اہلِ فکر کی تائید حاصل نہیں ہے۔

عورت کو مرد کی طرح مساوی طلاق کا اختیار نہ ملنے میں بہت سی حکمتیں ہیں، جن میں خاندان کا استحکام، اختیار اور ذمہ داری میں توازن، مرد پر عائد مالی ذمہ داریاں، طلاق کے سماجی اثرات کا لحاظ اور عورت کے لیے علیحدگی کے متبادل راستوں کی موجودگی شامل ہیں۔

طلاق کا اختیار عدالت کو دیے جانے کے نتائج:

ایک بڑا طبقہ اس کا قائل ہے کہ طلاق کا اختیار صرف عدالت کو دیا جائے۔ موجودہ وقت میں دنیا کے اکثر ممالک میں یہی نظام رائج ہے۔ اس رجحان کے حامیوں کا کہنا ہے کہ اس سے عورت اور بچوں کا بہتر تحفظ ہوتا ہے اور طلاق کے عمل میں نظم وضبط پیدا ہوتا ہے۔

تاہم اس رجحان کا عملی تجربہ بھی دنیا کے سامنے آچکا ہے۔ اس نظام میں فریقین کی نجی آزادی محدود ہونے کے علاوہ شرعی وقانونی نظام کے درمیان فاصلہ، اخراجات، فیصلوں میں تاخیر اور غریب طبقے کے لیے عدالتی نظام کی مشکلات جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

مزید برآں مغربی معاشروں میں اس نظام کے نتیجے میں خاندانی نظام کا عدم استحکام، طلاق کی بلند شرح، شادی کے رجحان میں کمی، شادی کے بغیر بچوں کی پیدائش میں اضافہ اور سنگل پیرنٹ (Single Parent) خاندانوں کی کثرت جیسے مظاہر بھی سامنے آئے ہیں۔

☆☆☆

ایک جائزہ

علامہ اقبالؒ اور ان کے تعلیمی نظریات

ڈاکٹر محمد عارف جنید ندوی

[عصر حاضر کے شہرت یافتہ ناقد، ادیب، تجزیہ نگار اور کلامِ اقبال کے ایک رمز شناس کی حیثیت سے معروف جناب افضل رضوی صاحب کی تحریر ''علامہ اقبال کا فکری وژن اور عصر حاضر کا تعلیمی بحران'' سے ڈاکٹر محمد عارف جنید ندوی صاحب نے عطر کشید کر کے علامہ مرحوم کے تعلیمی افکار کا خلاصہ پیش کیا ہے، جس کو قارئین کے لیے شائع کیا جارہا ہے]

علامہ اقبال بیسویں صدی کی ان عبقری شخصیات میں سے تھے جنہوں نے اپنے افکار، خیالات، فلسفے، تصنیفات، تالیفات، مضامین اور شعر وسخن کے ذریعہ، دنیا کے تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کیا وہ بذات خود جدید تعلیم گاہوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور یوروپ کے فاضل اساتذہ سے سند فضیلت حاصل کر چکے تھے دوسری طرف اپنے عصر کے علمائے دین اور علوم اسلامیہ کے ماہرین سے ان کے گہرے روابط اور تعلقات نے ان کے افکار وخیالات میں اسلامی آفاقیت، قرآنی علوم اور شریعت اسلامیہ کے اساسیات، عالمی تاریخ کے ساتھ اسلامی تاریخ اور اسلام کے شاندار ماضی کے ماثرات اور حقائق نے، ان کی فکر میں جولانی، عزائم میں پختگی، اسلامی تعلیمات میں بلند اعتمادی، اسوۂ رسول اور عشق رسول میں محبوبیت اور فدائیت، اسلامی نظام حیات میں مکمل رہنمائی اور سسکتی ہوئی انسانیت کے لئے اسلام کا نظام عدل وانصاف ہی مکمل حل، اسلام کا نظام تعلیم وتربیت کل بنی نوع انسانیت اور نسل جدید کے لئے روشن سنگ میل قرار دیتے تھے۔

انھوں نے دنیا کے تمام نصاب ہائے تعلیم و تربیت پر فاضلانہ تنقید کے ذریعہ اور ان کے تعلیمی فلسفوں، افکار ونظریات پر عالمانہ مفکرانہ افکار سے دنیا کو از سر نو سوچنے، غور وفکر کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کے مواقع فراہم کئے اور پختہ، ٹھوس اسلامی فلسفۂ تعلیم و تربیت کی اہمیت، افادیت اور ضرورت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور تعلیم کے میدان میں مغربی افکار اور فلسفوں نے دنیا کو جو گہرے، دیرپا نقصانات پہونچائے ہیں آگاہ کیا ہے، انھوں نے تنقید کے ساتھ ان تمام تعلیمی مسائل اور چیلنجیز کا حل بھی پیش کیا ہے جس کو عملی جامہ پہنا کر ایک مثالی نظام تعلیم نافذ کیا جاسکتا ہے۔

افضل رضوی صاحب اپنے ایک مضمون، جس کا عنوان ہے ''علامہ اقبال کا فکری وژن اور عصر حاضر کا تعلیمی بحران'' میں رقمطراز ہیں کہ موجودہ جدید نظام تعلیم نسل جدید کو اعلیٰ سہولیات تو فراہم کر رہا ہے؛ لیکن زندگی کے اعلیٰ مقاصد نہیں۔ علم ہے ادراک نہیں، ہنر ہے کردار نہیں:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
ہمارا مسلم نوآبادیاتی ڈھانچہ مغربی تہذیب کا فکری غلام نظر آتا ہے، علامہ اقبال کے آفاقی تعلیمی وژن میں من عرف ربہ فقد عرف نفسہ جا بجا نظر آتا ہے، وہ علم کو خودی کی دریافت کا سفر کہتے ہیں، جس میں انسان کو اپنے باطن، اپنا اسلامی تشخص، اپنا شاندار ماضی، اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے رب کا تعارف، تعلق اور اسی کی طرف راغب ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

ہمارے تعلیمی ادارے جدید عمارتوں، اسمارٹ بورڈز سے سجے ہوئے ہیں مگر سوچ قدیم اور مغرب کا فرسودہ نصاب اور غیر ملکی اندھی تقلید کے نتیجہ میں کردار سازی اور روحانی و اخلاقی تربیت کا فقدان ہے، اس کے نتیجہ میں نسل جدید میں قابلیت، ہنرمندی، پیشہ ورانہ مہارتیں تو پروان چڑھ جاتی ہیں مگر آفاقی شعور کی تربیت، شخصیت سازی کا ہنر مفقود ہو جاتا ہے، علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا:

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ، لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

ہم جب علامہ اقبال کے افکار کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ تعلیم کا بحران؛ درحقیقت تہذیبی بحران ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب قومیں اپنی فکری بنیادوں سے ہٹتی ہیں تو ان کی تعلیم سب سے پہلے بے روح ہوجاتی ہے، وہ کہتے ہیں:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ان کے نزدیک موجودہ نظام تعلیم میں تربیتِ حسنہ کے فقدان نے تعلیم کو بے روح اور بے شعور

بنا دیا ہے، اسلامی نظام تعلیم میں استاذ کی حیثیت صرف معلم ہی کی نہیں بلکہ مربی، رہنما، مصلح اور روحانی نگہبان کی ہوتی ہے، اقبال کے نزدیک استاذ کا مقام

اس دور میں بھی مردِ خدا کو ہے میسر
جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی

وہ مزید کہتے ہیں:

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر
مرغ چمن ! ہے یہی تیری نوا کا صلہ

علامہ اقبال، طلباء سے عاجزانہ، خادمانہ طرز عمل کے ساتھ استاد سے استفادہ کے ترجمان نظر آتے ہیں، ان کے نزدیک تعلیم محض معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ ایک زندہ، تخلیقی اور القائی عمل ہے جو فرد کی داخلی دنیا کو بدل کر معاشرے اور تاریخ کی سمت متعین کرتا ہے۔ جس طرح دین اور دنیا ایک ہیں، الگ نہیں، اسی طرح دینی علوم وفنون اور دنیوی تعلیم اور سائنس الگ نہیں ہیں ۔وہ میکالے کے نظریہ کو مسترد کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کے مطابق تعلیمی اصلاح کا آغاز تعلیم کے مقصد کے تعین سے ہوتا ہے جب تک قوم یہ طے نہیں کرتی کہ وہ کس قسم کا انسان پیدا کرنا چاہتی ہے اس وقت تک نصاب، ادارے اور پالیسیاں بے سمت رہتی ہیں۔ وہ تعلیم کے ذریعہ خود آگاہی اور شخصیت سازی کی ہمہ گیر تعمیر کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور ایسے نصاب کی وکالت کرتے ہیں جس میں مذہب، فلسفہ، فنون اور سائنسیز کا باہمی امتزاج ہو؛ تاکہ ایک متوازن باشعور اور ہمہ جہت انسان تشکیل پا سکے:

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی، موت ہے، کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

علامہ کہتے ہیں کہ تعلیم جسے تہذیب کا محور ہونا چاہئے تھا، اور جس سے طلباء کے دلوں میں عشق محمد ﷺ کی شمع روشن ہونا چاہئے تھی، دور جدید کے تعلیمی اداروں نے عشق کی اس چنگاری کو دبا دیا اور جذباتِ فراوانی سے بالکل خالی کر دیا ہے، وہ عشق جو کبھی عقل کو یہ کہا کرتا تھا کہ تو خواہ مخواہ کے بہانے بنا کر زندگی کی اصل حقیقت سے دور نہ ہو آج وہ جذبۂ عشق تجھ میں نہیں رہا، جس کی بنا پر تری عقل نے مادر پدر آزادی حاصل کر کے تجھے اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا ہے:

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانہ نہ تراش

علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ تعلیمی ادارے ایسی تعلیم وتربیت سے کنارہ کشی اختیار کر لیں جو طلباء کو محبت رسول ﷺ سے بیگانہ کر دے اور اس کے ذہن کا مرکز محض حصولِ روزگار بنا دے، چنانچہ وہ ان تعلیمی اداروں کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفّاش

علامہ اقبال عصر حاضر کے طلباء سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

علامہ اقبال، تعلیم کے پورے نظام کو ایک نئے عمرانی معاہدے کے طور پر دیکھتے ہیں جس میں عقل، تجربہ، وجدان اور وحی ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ تکمیلی کردار ادا کرتے ہیں، گویا علامہ اقبال کا تعلیمی وژن نہ صرف مذہبی ہے، اور نہ محض سائنسی؛ بلکہ ایک جامع انسانی وژن ہے جو جدید دنیا کے فکری، اخلاقی، دینی اور اسلامی بحران کا عملی حل پیش کرتا ہے:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

علامہ اقبال کے نظریہ تعلیم کے مطابق موجودہ جدید تعلیمی بحران کے مندرجہ بالا اسباب وعلل کے حل کے لئے ضروری ہے کہ ہم نیک نیتی سے ان اصلاحی اقدامات پر از سر نو غور وخوض کریں۔ ہمیں سب سے پہلے تعلیم کے موجودہ تصور میں انقلابی تبدیلی کرنا ہوگی؛ کیونکہ غلط تصور تعلیم پر تعمیر ہونے والے نظریات، فلسفے، تعلیمی انتظامی ڈھانچے، تعلیمی نصاب، تعلیم وتربیت کے طریقے اور اساتذہ کی سوچ، تدریسی تعلیمی تربیت پر مبنی مواد کو قرآنی مبادیات، اسلامی تعلیمات اور اسوۂ نبویؐ اور مشیت الٰہی پر مبنی عقائد، قرانی آیات، تذکیہ، کتاب وحکمت اور آفاق وانفس میں پھیلی ہوئی خدائی کائنات پر غور وخوض پر مبنی جدید سائنس اور جدید ارتقائی اختراعات اور امکانات کے صحیح استعمال اور بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود اور انسانی جان کے تحفظ اور انسانی اقدار کی نشوونما پر مبنی اصلاحی اقدامات کو بتدریج اصلاحی منصوبے بنا کر کام کرنا ہوگا، ہمیں اپنے اداروں، تعلیم گاہوں، جامعات اور مدارس میں ایسے انسان تیار کرنا ہوں گے جو بیک وقت اسلام کے بنیادی اصولوں سے کما حقہ واقف ہی نہ ہوں بلکہ اسکے ترجمان ہوں اور دوسری طرف جدید تعلیمی تقاضوں اور عصر حاضر کی ضرورتوں اور چیلنجوں کو مدنظر رکھ کر خدا کی اس کائنات اور اس کے قدرتی وسائل و ذرائع کو انسانیت کی فلاح و بہبود میں صرف کریں اور اس دنیا کو امن کا گہوارہ، عبدیت الٰہی کی آماجگاہ اور عشق رسول کا متوالا بنا دیں۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں مردوں کی شمشیریں

☆☆☆

فکرِ مآل

حیاتِ فانی اور حیاتِ جاودانی

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

انسان اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا؛ بلکہ اسے ایک محدود مدت کے لیے اس دارِ امتحان میں بھیجا گیا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال، افکار اور کردار کے ذریعے اپنی ابدی زندگی کا سامان مہیا کرے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم بار بار انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ دنیا کو مقصد نہ بناؤ؛ بلکہ اسے آخرت تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھو۔

آج کا انسان ایک عجیب فکری تضاد کا شکار ہے؛ وہ فانی دنیا کے گھر کو مضبوط بنانے میں پوری عمر لگا دیتا ہے؛ مگر باقی رہنے والے گھر یعنی آخرت کی تعمیر سے غافل رہتا ہے، کاروبار کے لیے منصوبے بنتے ہیں، دنیاوی تعلیم کے لیے سالہا سال محنت ہوتی ہے، جائیداد کے لیے جدوجہد ہوتی ہے، مگر نماز، توبہ، اخلاق، صدقہ، علمِ نافع اور اصلاحِ نفس کے لیے فرصت نہیں مل پاتی۔

قرآنِ مجید نے انسان کی اسی غفلت کو یوں بیان کیا:

"ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ" [سورۃ الحجر: ۳] (انہیں چھوڑ دو، کھائیں، فائدے اٹھائیں اور لمبی امیدیں انہیں غفلت میں رکھیں، پھر عنقریب جان لیں گے)۔

اور فرمایا:

"يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ" [سورۃ الروم: ۷] (وہ دنیاوی زندگی کا صرف ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں)۔

ہر انسان کو اپنی زندگی سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، اور وہ اس کی بقا و حفاظت کے لئے ہر جتن کرتا ہے، جسمانی قوت و توانائی کے لئے غذا کی فکر کرتا ہے، سردی گرمی سے بچنے کے لئے لباس کا انتظام کرتا ہے، سکون و اطمینان اور آرام و راحت کے ساتھ رہنے کے لئے مکان بناتا ہے، لذت کام و دہن کے لئے ماکولات و مشروبات کی جملہ اقسام کو سمیٹ لینے کا خواہاں رہتا ہے، بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لئے صاف ستھری اور جراثیم سے پاک جگہوں کا انتخاب کرتا ہے، ان چیزوں کے حصول کو وہ اتنا ضروری سمجھتا ہے کہ ان کے حاصل کرنے میں اکثر حدود و قیود کو پار کر جاتا ہے؛ بلکہ اپنے اور اپنے متعلقین کے سوا سب کو بھول جاتا ہے، خود کو سارے وسائل حاصل ہوں چاہے دوسروں کا خون چوس کر، اور دوسروں کے گھر کا چراغ بجھا کر، یہ وہ حقائق ہیں جن کو عالم و جاہل، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سبھی جانتے ہیں اور یہ شب و روز ہم سب کے تجربہ میں آتے رہتے ہیں۔

مگر یہ انسان یہ نہیں سوچتا اور ادھر اس کا ذہن نہیں جاتا کہ یہ چیزیں تو دیگر تمام مخلوقات میں مشترک ہیں اور ہر مخلوق اپنے رہنے، کھانے اور اپنی جان کی حفاظت کی فکر کرتی ہے حتیٰ کہ سانپ جس کا ایک قطرۂ لعاب انسان کو موت کی نیند سلا دیتا ہے، وہ بھی اپنی جان کے لئے خائف رہتا ہے، اور زندگی کی بقا کے لئے محفوظ مقامات اور اپنے دشمنوں سے حفاظت کی جگہیں تلاش کرتا ہے، یہ ہمارا ہر وقت کا مشاہدہ ہے، ہم ہر جاندار میں یہ بات محسوس کرتے ہیں؛ لیکن انسان اور دیگر مخلوقات میں وجہ امتیاز کیا ہے؟ اس پر نظر کم جاتی ہے؛ بلکہ بہت کہنے سننے اور توجہ دلانے کے بعد بھی اس پر غور کرنے کی فرصت نہیں ملتی، کہ انسان کے اس جسمانی نظام کے ساتھ اس کا ایک روحانی نظام بھی ہے، جس کو اسی طرح غذا، صاف ستھری فضا اور سازگار حالات و ماحول کی ضرورت ہے جس طرح جسم کو، اور حقیقت یہ ہے کہ یہی دوسری چیز وہ جو اصلی ہے جس کی وجہ سے انسان کو دیگر تمام مخلوقات پر امتیاز و برتری حاصل ہے، اگر وہ اپنی اس حقیقت کو پہچانتا ہے تو اپنے سر پر "لقد خلقنا الانسان فی أحسن تقویم" کا تاج رکھتا ہے اور پھر صحیح اور حقیقی معنیٰ میں فرشتوں کو بھی اس پر رشک آتا ہے؛ بلکہ وہ اس کے اعزاز و تکریم میں اس کے لئے استغفار کرتے ہیں، بنی نوع انسان پر اللہ تعالیٰ کا یہ مزید انعام ہے کہ افضل الخلائق بنا کر اس کو اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیا؛ بلکہ اس کے اس امتیازی وصف کے سلسلہ میں ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنے رسولوں اور آسمانی کتب کا سلسلہ جاری فرمایا۔

مگر کیا فائدہ؟ انسان جتنی فکر اپنے فانی اور معدوم ہوجانے والے جسم کے لئے کرتا ہے اس کا عشر عشیر (دسواں حصہ) بھی اپنے دائمی اور ابدی و روحانی نظام کے لئے کرتا ہے؟ یہ کتنی بڑی بھول اور نادانی ہے کہ مسافر اپنی منزل سے غافل و بے خبر ہو کر ساری توانائی و صلاحیت اسبابِ سفر اکٹھا کرنے میں صرف کردے؟!

یہ دنیا اپنی حقیقت میں نہ دائمی ہے، نہ کامل۔ اس کی حقیقت کو قرآن نے ایک کھیتی سے تشبیہ دی: بارش ہوئی، سبزہ اگا، انسان خوش ہوا، پھر وہی سبزہ زرد ہو کر بکھر گیا، انسان کی عمر، دولت، حسن، طاقت

اور شہرت بھی اسی طرح ایک دن ضرور ختم ہو جاتی ہے؛ لیکن اسلام دنیا سے فرار نہیں سکھاتا، اسلام رہبانیت کا مذہب نہیں؛ اسلام سکھاتا ہے کہ دنیا میں رہو، محنت کرو، تجارت کرو، علم حاصل کرو، گھر بناؤ، عزت کماؤ، مگر دل آخرت سے وابستہ رکھو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا" [القصص: ۷۷] (اللہ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر تلاش کرو اور دنیا میں اپنا حصہ بھی نہ بھولو)۔

یہ آیت اسلام کا متوازن نظریہ پیش کرتی ہے: دنیا کو چھوڑو نہیں، مگر دنیا کے ذریعہ آخرت بناؤ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ" (عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے)۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر دن آخرت کی عمارت تعمیر کر رہا ہے؛ یا تو نیکیوں کی اینٹیں لگا رہا ہے یا غفلت سے اسے گرا رہا ہے۔

نماز، تلاوت، والدین کی خدمت، حسنِ اخلاق، حلال روزی، علمِ نافع، صدقہ، بچوں کی اچھی تربیت، یہ سب آخرت کے سرمایہ ہیں۔ دنیا میں کامیابی اچھی چیز ہے، مگر اگر وہ آخرت سے غافل کر دے تو خسارہ ہے؛ اور اگر آخرت کی راہ بن جائے تو یہی عبادت ہے۔

آخر میں ہر انسان کو خود سے یہ سوال کرنا چاہیے: میں جس گھر کے لیے اتنی محنت کر رہا ہوں، وہ کتنے سال ساتھ رہے گا؟ اور جس آخرت میں ہمیشہ رہنا ہے، اس کے لیے آج میں نے کیا تیار کیا؟

اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا کو آخرت کی کھیتی بنانے، غفلت سے بچنے اور حسنِ خاتمہ نصیب فرمائے، آمین۔

☆☆☆

'سلطانِ جمہوری' کا زمانہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اس زمانہ کا چیلنج یہ ہے کہ اسلام کو اس کی جداگانہ تہذیب، اس کی مخصوص معاشرت، اس کے عائلی قوانین، اس کے وسائل معرفت، اس ملک، اس کے ماننے والوں کی نسلی زبان و ادب، رسم الخط اور اس کے پورے دینی وتہذیبی ورثہ سے الگ کر دیا جائے اور اسلام چند عبادات اور چند رسوم وتقریبات (جو بعض مذاہب کا کل سرمایہ اور بعض قوموں کا واحد مذہبی نشان ہے) اسلام انہیں مذہبی ومعاشرتی رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جائے، مسلمانوں سے کبھی اشارہ کنایہ سے اور کبھی صاف صاف کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنی رضا ورغبت سے اپنی جداگانہ تہذیب اور ہر اس چیز سے بے تعلقی اختیار کر لیں، جو ان میں الگ ملت اور ایک مستقل تہذیب کا وارث ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے، وہ خود ہی اعلان کر دیں کہ ہم کسی جداگانہ تہذیب کے حامل نہیں، وہ خود اپنے عائلی قانون میں اصلاح وترمیم کا مطالبہ کریں یا پیش کیا جائے تو اس کو قبول کریں، وہ اپنے تمام تعلیمی مرکزوں کو جو انہوں نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق قائم کیے تھے، حکومت کی تحویل وانتظام میں دے دیں اور ان کے نظم ونسق سے خود دست بردار ہو جائیں تاکہ ان سے ایک ہی طرح کے نمونے تیار کیے جائیں، اصل خطرہ نسل کشی کا نہیں، معنوی ارتداد اور ذہنی وتہذیبی نسل کشی کا ہے، اس خطرہ کو دیکھنے اور اس کو محسوس کرنے کے لیے کسی بڑی فراست اور دور بینی کی ضرورت نہیں، یہ تو دیوار کا نوشتہ ہے جس کو ہر ایک پڑھ سکتا ہے اور اب تو بعض برسر اقتدار پارٹیوں اور علاقائی حکومتوں نے نصاب تعلیم کی تبدیلی، ہندی زبان کو لازمی قرار دینے اور اس کی جبریہ تعلیم اور ایک نئی تاریخ ترتیب دینے کے اعلان کے ذریعہ اس کا فیصلہ اور پالیسی کے طور پر اعلان بھی کر دیا ہے۔

یہ 'سلطان جمہوری' کا زمانہ ہے، ہمارے اوپر پارلیمنٹ اور ریاستوں میں اسمبلیوں کی حکومت ہے اور ان کو آئین سازی کا پورا اختیار ہے، پھر حکومت کا دائرہ پہلے کی طرح دفاعی، امن قائم کرنے اور ٹیکس وصول کرنے کی حد تک محدود نہیں، وہ زندگی کے تمام شعبوں اور تعلیم و تربیت کے تمام ذرائع پر حاوی ہے، آپ کو معلوم ہے کہ پرانی حکومتیں پرائیوٹ معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں، ذاتی ملکیتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، آزاد درسگاہوں سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا، پرسنل لاء سے ان کا کوئی علاقہ نہیں تھا، تعلیم میں کسی خاص عقیدہ، کسی خاص فکر ومقصد پر ان کو اصرار نہ تھا لیکن اب یہ صورت حال نہیں۔

☆☆

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

نام کتاب: **بیت الحکمت**

از: ڈاکٹر سید عبدالرشید

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلام کا ظہور ہوا، اور وہ رفتہ رفتہ جزیرۃ العرب میں پھیلتا چلا گیا، اور چوتھائی صدی یا اس سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گذرا ہوگا کہ روم و فارس بھی اہلِ اسلام کے زیرِ نگیں آ گئے، اس طرح یہ اقوام جو قدیم تہذیب و ثقافت کے حامل تھیں؛ اسلامی و عربی تہذیب و ثقافت سے مغلوب ہوگئیں۔

اسلام ایک نئے دین اور نئی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ ابتدا میں دین و عقائد کی اصلاح اور کتاب وسنت کی حفاظت اور جمع وتدوین پر توجہ مرکوز رہی، جو ناگزیر تھی؛ لیکن بعد میں جب اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو اہلِ اسلام کی توجہ ان علوم وفنون کی طرف بھی مرکوز ہوئی جو اس دنیوی زندگی کو برتنے میں معاون ہوسکتے تھے، ان کے ذریعہ انسانیت کی بڑی خدمت کی جاسکتی تھی، اور وہ عقل و دانش کو ترقی دے کر خود کتاب وسنت کے فہم و ادراک اور معرفتِ خداوندی کے حصول میں بھی مفید ثابت ہوسکتے تھے، اور نہ صرف یہ کہ اسلام نے ان کے حصول پر کوئی بندش لگائی تھی؛ بلکہ کتاب وسنت میں مضمر بہت سے علمی و سائنسی نکات اور اشاریے ان کے حصول کی ترغیب دیتے تھے۔

اس توجہ کے نتیجہ میں عہدِ عباسی میں خلیفہ ابو جعفر کے دور میں ''بیت الحکمۃ'' کی بنا پڑی، اور آگے چل کر خلیفہ ہارون رشید اور مامون رشید کے عہد میں اس نے اپنے عہدِ زریں تک رسائی حاصل کرلی۔ یہ محض ایک کتابوں کے ترجمہ کا ایک رسمی ادارہ نہ تھا، جیسا کہ عام تصور ہے؛ بلکہ علوم وفنون کی دنیا میں ایک انقلابی تحریک تھی، اور قدیم تہذیبوں کی تمدنی ترقیات کا سرمایہ جو بہ ظاہر بے رخی کا شکار تھا اور ضائع ہونے جارہا تھا؛ اس کی حفاظت، اس سے استفادہ، اور اس کی تنقیح وتحقیق کے لیے قائم کردہ ایک اکیڈمی تھی، جس نے ایک طرف ان علوم وفنون کے احیاء، ان کی نشر واشاعت، اور ان کو ترقی اور فروغ دینے میں ایک بڑا کردار ادا کیا، وہیں دوسری طرف ان اقوام کا وہ علمی وفنی سرمایہ جو ان کی تمدنی ترقیات کی بنیاد تھا، اس کا پورا نہیں تو ایک بڑا اور اہم حصہ اہلِ اسلام کی طرف منتقل کردیا، جس سے اہلِ اسلام میں فلسفہ وسائنس، طب وحکمت اور دیگر علوم وفنون کی طرف توجہ اور رغبت پیدا ہوئی، اور پھر انھوں نے ان علوم کو نہ صرف یہ کہ انھیں حاصل کیا؛ بلکہ ان میں قابلِ قدر اضافہ بھی کیا، اور ترقی دی۔

بیت الحکمۃ میں ترجمہ کے ذریعہ یونانی، سریانی، رومی، پہلوی، فارسی اور سنسکرت جیسی قدیم تہذیبی زبانوں سے منطق و فلسفہ، فکر و ادب، طب وحکمت اور حساب و ریاضیات وغیرہ جیسے بنیادی علوم وفنون عربی زبان میں منتقل ہوئے، جو خطۂ اسلام کے وسیع ترین رقبہ میں سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے دیگر زبانوں پر غالب آتی جارہی تھی، اس طرح یونان وروم و فارس ہی نہیں؛ قدیم ہندوستان کے بھی علمی وفکری سرمایہ کا ایک قابلِ قدر اور مفید حصہ اس ادارہ کے تحت عربی میں منتقل ہوگیا۔

''بیت الحکمۃ'' کے نام سے ملتِ اسلامیہ کا دانشور طبقہ خوب واقف ہے، اور علوم وفنون کی ترقی میں اس نے جو کردار ادا کیا اس کا ایک اجمالی تصور ہر ایک اپنے ذہن میں رکھتا ہے؛ لیکن اس کی تاریخ، اس کی نشونما، اس کے بانی مبانی، اس کے کارنامے، اس میں کام کرنے والے افراد، اور تہذیب وتمدن اور ثقافت کی دنیا پر اس کے اثرات کے بارہ میں واقفیت بہت سطحی اور معمولی ہے۔

جناب ڈاکٹر سید عبد الرشید صاحب؛ جنھوں نے عرب وعجم کے دانشکدوں سے فیض اٹھایا ہے، اور اس وقت عالیہ یونیورسٹی کلکتہ میں معاون استاذ کی حیثیت سے کام کررہے ہیں؛ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ بیت الحکمت کے موضوع پر مستقل طور پر کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، اور زیادہ تر اس کا تذکرہ تاریخی مصادر میں ضمناً آیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ لوگ اس ادارہ کے بارہ میں مکمل طور پر معلومات نہیں رکھتے، اور نتیجتاً اس کی عظمت واہمیت سے کما حقہ عام طور پر

واقفیت نہیں ہے، ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے اس عظیم ادارہ اور تحریک کے تعارف کے لیے مستقل ایک کتاب تصنیف کی جو عمدہ طباعت اور ضخیم جسامت کے ساتھ اس وقت ہمارے سامنے ہے، اور عہدِ رفتہ کی یاد دلا رہی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے جہاں اس ادارہ کے تعلق سے بڑے بڑے انکشافات ہوتے ہیں، اور اس کی تاریخ، نظم و انتظام، شعبہ جات، مترجمین و مصنّفین اور اس کے آثار وثمرات کی وسعت معلوم ہوتی ہے، وہیں صاحبِ کتاب کی وسعتِ علمی، دقتِ نظری اور عرق ریزی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت جو ہمیں نظر آئی وہ یہ کہ فاضل مصنف نے مصادر کی درجہ بندی میں بڑی دانشوری اور معقولیت سے کام لیا ہے؛ انھوں نے مؤرخین اور تذکرہ نگاروں میں بڑے چھوٹے ناموں کی بنا پر درجہ بندی نہیں کی؛ بلکہ ان لوگوں کو مقدم رکھا' جن کا براہِ راست' بیت الحکمت سے واسطہ رہا ہے، جنھوں نے اس میں کام کیا ہے، یا اس سے بذاتِ خود استفادہ کیا ہے۔ باقی مصادر ثانوی درجہ میں رکھے ہیں۔ اور یہ طریقہ استنادی اعتبار سے زیادہ درست اور قابلِ اعتماد معلوم ہوتا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے موضوع کو تشنہ کام نہیں چھوڑا؛ بیت الحکمت کی تاسیس ہو، اس کی نشوونما ہو، اس کا عروج ہو، اور پھر آخر میں اس کا زوال ہو، تقریباً پانچ سو سالہ تاریخ میں اس کا نظام، انتظام و انصرام، مترجمین و مصنّفین و مستفیدین، اس کا دائرۂ کار، اس کے شعبے اور ان میں ہونے والے کام، اور اس کے دور رس اثرات، وغیرہ وغیرہ، اس ادارہ کے تاریخی پہلوؤں میں شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو' جو ناقص و ناتمام رہ گیا ہو۔

آیئے! کتاب کی فہرست پر اک سرسری نظر ڈال کر اس کے مندرجات کا اندازہ کیا جائے:

کتاب کل چھ ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب: پس منظر اور قیام

پہلی فصل: 'اموی دور میں عقلی علوم'، دوسری فصل عباسی دور کی علمی سرگرمیاں، تیسری فصل 'بیت الحکمت کی بانی کی تعیین'۔

دوسرا باب: انتظامیہ

پہلی فصل: بیت الحکمت کے نام کی تحقیق، دوسری فصل: عمارت اور محل وقوع، تیسری فصل: بیت الحکمت کا تنظیمی ڈھانچہ، چوتھی فصل: بیت الحکمۃ کا عملہ اور عہدے، پانچویں فصل: عملہ کی تقرری، چھٹی فصل: بیت الحکمت کا مالی نظام (اور وظائف اور انعامات)۔

تیسرا باب:

فصلِ اول: ترجمہ نگاری (اور اس کے اسباب)، فصلِ ثانی: بیت الحکمت سے وابستہ مترجمین (اور ان کے انتخاب کا طریقۂ کار)، فصلِ سوم: بیت الحکمت میں ترجمہ شدہ اہم کتب۔

چوتھا باب: شعبۂ تصنیف وتالیف

فصلِ اول: تصنیف و تالیف کے اسباب، فصلِ دوم: اہم مصنفین، فصلِ سوم: اہم تصنیفات۔

پانچواں باب: دیگر شعبہ جات

فصلِ اول: کتب خانہ، فصلِ دوم: رصد گاہ، فصلِ سوم: تعلیم وتربیت۔

چھٹا باب: زوال واثرات

فصلِ اول: زوال (اور اس کے مراحل)، فصلِ دوم: بیت الحکمت کے وارث، فصلِ سوم: بیت الحکمت کے اثرات (اور اس کے زیرِ اثر بننے والے ادارے)۔

ان ابواب وفصول پر ایک نظر ڈالنے سے ہی صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک 'اکیڈمک ورک' ہے، اور عصرِ حاضر اور موضوع دونوں کے تحقیقی تقاضوں کے پورا کرتی ہے۔ مصنف' عربی زبان پر مہارت کے ساتھ انگریزی زبان سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، اور انھوں نے اردو، انگریزی اور عربی تینوں زبانوں کے مصادر سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

ہماری رائے میں اس کتاب کا عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی ترجمہ ہونا چاہیے؛ تاکہ اس کا افادہ عام سے عام ہو، خاص طور پر انگریزی زبان میں، تاکہ غیروں تک بھی اس کی رسائی ہو، اور علمی، فکری، ادبی، فلسفی اور سائنسی میدانوں میں اہلِ اسلام کی اس عظیم خدمت سے ساری دنیا واقف ہو۔

تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل' یہ کتاب 'انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی' سے شائع ہوئی ہے۔ حصول کے لیے رابطہ کریں:

موبائل نمبر:

۹۳۱۵۱۷۷۳۹۹

ایمیل:

qazipublishers@yahoo.com

☆☆☆

اصلاحِ حال

محرم الحرام فکر واحتساب کا مہینہ

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اسلامی سال کا آغاز محرم الحرام سے ہوتا ہے۔ یہ محض تاریخ کے اوراق پر ایک نئے عدد کا اضافہ نہیں، بلکہ وقت کے بے رحم سفر میں ایک ایسا پڑاؤ ہے جو انسان کو رک کر اپنے سفر کا جائزہ لینے اور منزل کی سمت کو ازسرنو متعین کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ انسان اس دنیا میں ایک مسافر ہے اور یومِ قیامت اس کی آخری منزل۔ زندگی کی یہ طویل شاہراہ مختلف مرحلوں، موڑوں اور پڑاؤوں پر مشتمل ہے؛ کہیں راحت کے سائے ہیں تو کہیں آزمائشوں کی تپتی دھوپ، کہیں کامیابی کی منزلیں ہیں تو کہیں صبر واستقامت کے کٹھن مرحلے۔

محرم الحرام کا آغاز گویا اس سفرِ حیات میں ایک ایسا مقام ہے جہاں مسافر اپنے زادِ راہ کا جائزہ لیتا ہے، پیچھے رہ جانے والے مراحل پر نظر ڈالتا ہے اور آنے والے راستوں کے لیے خود کو تیار کرتا ہے۔ وہ چند لمحے ٹھہر کر سوچتا ہے کہ سفرِ حیات کے گزشتہ مرحلوں میں اس نے اپنے دامن میں کیا سمیٹا، کن مواقع کو گنوا دیا اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے اس کے زادِ راہ میں کتنا اضافہ ہونا باقی ہے۔

محرم الحرام محاسبۂ نفس، بیداریِ شعور اور اصلاحِ احوال کا پیغام لے کر آتا ہے۔ زندہ قومیں اپنے حالات کا جائزہ لیتی ہیں، اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتی ہیں اور مستقبل کے لیے بہتر منصوبہ بندی کرتی ہیں۔ امتِ مسلمہ کے پاس آج بھی انسانیت کی رہنمائی کا عظیم سرمایہ موجود ہے، لیکن اسے مؤثر بنانے کے لیے سب سے پہلے اپنے اندر احساسِ ذمہ داری اور خود احتسابی پیدا کرنا ہوگی۔ محاسبہ ہی اصلاح کا پہلا زینہ اور ترقی کا بنیادی راز ہے۔

علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

صورتِ شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اللہ تعالیٰ نے جن چار مہینوں کو خصوصی حرمت عطا فرمائی ہے، محرم ان میں سے ایک ہے۔ اس مہینے کی عظمت کا تقاضا ہے کہ انسان گناہوں سے بچے، اپنے تعلقِ مع اللہ کو مضبوط بنائے اور اپنی زندگی کو خیر وتقویٰ کے راستے پر استوار کرے۔ اسی مہینے کی ایک بڑی فضیلت عاشورہ کا روزہ ہے۔ احادیث مبارکہ کے مطابق اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون کے ظلم سے نجات عطا فرمائی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اس دن روزہ رکھا، اس کی ترغیب دی اور فرمایا کہ عاشورہ کا روزہ گزشتہ ایک سال کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ اس لیے اس مبارک دن کو عبادت، دعا، ذکر اور شکر الٰہی کے ساتھ گزارنا چاہیے۔

بدقسمتی سے محرم کے حقیقی پیغام کو پس پشت ڈال کر امت کا ایک بڑا طبقہ مختلف رسوم ورواج اور غیر شرعی اعمال میں مبتلا ہوگیا ہے۔ حضرت حسینؓ کی شہادت بلاشبہ تاریخِ اسلام کا ایک عظیم اور دل خراش سانحہ ہے۔ اہل بیتِ نبوی ﷺ سے محبت ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے، لیکن اسلام نے غم کے اظہار کے لیے بھی اعتدال اور حکمت کا راستہ متعین کیا ہے۔ مصیبت کو ہر سال تازہ کر کے سوگ و ماتم کو مذہبی شعار بنالینا، نوحہ و ماتم کو عبادت کا درجہ دینا یا جائز خوشیوں سے اجتناب کرنا اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مصیبت کے موقع پر صبر، رضا اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی تعلیم دی ہے۔

اہل بیتؓ سے محبت کا تقاضا یہ نہیں کہ ان کے نام پر نئی نئی رسمیں ایجاد کی جائیں، شبیہیں بنائی جائیں، تابوت سجائے جائیں، جلوس نکالے جائیں یا خود کو لہولہان کیا جائے؛ بلکہ محبت کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ ان کی سیرت، ان کی قربانی، ان کے صبر اور حق پسندی کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا جائے۔ حضرت حسینؓ نے باطل کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا بلکہ حق کی خاطر ہر چیز قربان کردی۔ ان کی یاد کا سب سے مؤثر اور پائیدار طریقہ یہی ہے کہ ہم بھی حق وانصاف پر ثابت قدم رہیں اور دین کی خاطر ہر قربانی کے لیے تیار رہیں۔

آج کا مسلمان جن فکری، اخلاقی اور سماجی چیلنجوں سے دوچار ہیں، ان کا مقابلہ مصنوعی جذبات، رسمی نعروں، نمائشی ماتم اور جذباتی فنکاری سے نہیں کیا جاسکتا، بلکہ صحیح فکر، مضبوط کردار اور عملی جدوجہد ہی اس کا راستہ ہے۔ اگر محرم ہمیں یہ شعور عطا کردے کہ ہم رسموں کے بجائے اقدار، نعروں کے بجائے کردار اور جذباتی مظاہروں کے بجائے عملی وفاداری کو اختیار کریں، تو یہی واقعۂ کربلا کی صحیح یاد اور حضرت حسینؓ کے ساتھ حقیقی محبت کا ثبوت ہوگا!!

☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۲۵/جون ۲۰۲۶ء

Date 25th June 2026

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دینِ حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا